© rasailojaraid.com

سیاست کی دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہ کسی پرائیویٹ آدمی کا کام نہ تھا جس نے بس خدا کی کتاب پڑھ پڑھ کر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جدوجہد کر ڈالی ہو۔ بلکہ یہ خدا کے اُس نمائندے کا کام تھا جس نے کتاب کے ساتھ براہِ راست خدا ہی سے علم اور بصیرت کی روشنی بھی پائی تھی۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جب ہمیں دوسری سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ما انزل اللہ کی پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے مراد محض قرآن ہی کی پیروی نہیں ہوتی، بلکہ اُس حکمت اور اس نور اور اس میزان کی پیروی بھی ہوتی ہے جو قرآن کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی تھی اور جس کا ظہور لامحالہ حضورؐ کی سیرت و کردار اور حضورؐ کے اقوال و افعال ہی میں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہیں یہ کہتا ہے کہ ما انزل اللہ کی پیروی کرو (مثلاً آیت ۷:۳ میں) اور کہیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو (مثلاً آیات ۳:۳۱-۳۲ : ۲۱ اور ۷ : ۱۵۶ میں)۔ اگر یہ دو مختلف چیزیں ہوتیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کی ہدایات متضاد ہو جاتیں۔

سنت کہاں ہے؟ آپ کا تیسرا سوال یہ ہے:

"وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟"

اس سوال کے دو حصے الگ الگ ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ "وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟" بعینہٖ یہ سوال آپ پہلے مجھ سے کر چکے ہیں اور میں اس کا مفصل جواب دے چکا ہوں۔ مگر آپ اسے پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا آپ کو سرے سے کوئی جواب ملا ہی نہیں۔ براہِ کرم اپنا اوّلین خط اٹھا کر دیکھیے جس میں سوال نمبر ۲ کا مضمون وہی تھا جو آپ کے اس تازہ سوال کا ہے۔ اس کے بعد میرا دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے[1] جس میں میں نے آپ کو اس سوال کا تفصیلی

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب ہٰذا صفحہ ۳۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب دیا ہے۔ اب آپ کا اسی سوال کو پھر پیش کرنا اور میرے پہلے جواب کو بالکل نظر انداز کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو آپ اپنے ہی خیالات میں گم رہتے ہیں اور دوسرے کی کوئی بات آپ کے ذہن تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں پاتی، یا پھر آپ یہ بحث محض برائے بحث فرما رہے ہیں۔

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے؟ رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ تو اس کا جواب سننے سے پہلے ذرا اس بات پر غور کر لیجیے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری جو اللہ میاں نے لی تھی اس کو انہوں نے براہِ راست عملی جامہ پہنایا، یا انسانوں کے ذریعہ سے اس کو عملی جامہ پہنوایا؟ ظاہر ہے آپ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ اس حفاظت کے لیے انسان ہی ذریعہ بنائے گئے۔ اور عملاً یہ حفاظت اس طرح ہوئی کہ حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا۔ پھر ہزاروں سے لاکھوں، اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسلٍ لیتے اور یاد کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جاتے، یا اس میں کسی وقت کوئی ردوبدل ہوا اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجاتے۔ یہ حفاظت کا غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری کتاب کے لیے نہیں ہو سکا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے۔

اچھا، اب ملاحظہ فرمائیے کہ جس رسول کو ہمیشہ کے لیے اور تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا تھا اور جس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا، اس کے کارنامۂ حیات کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا محفوظ فرمایا کہ آج تک تاریخِ انسانی میں گزرے ہوئے کسی نبی، کسی پیشوا، کسی لیڈر اور رہنما اور کسی بادشاہ یا فاتح کا کارنامہ اس طرح محفوظ نہیں رہا ہے۔ اور یہ حفاظت بھی انہی ذرائع سے ہوئی ہے جن ذرائع سے قرآن کی حفاظت ہوئی ہے۔ ختم نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسولؐ کی رہنمائی اور اس کے نقوشِ قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری سے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع جریدۂ عالم پر ان نقوش کو کیسا ثبت کیا ہے کہ آج کوئی طاقت انہیں مٹا نہیں سکتی۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ وضو، یہ پنجوقتہ نماز، یہ اذان، یہ مساجد کی نماز با جماعت، یہ عیدین کی نمازیں، یہ حج کے مناسک، یہ بقرعید کی قربانی، یہ زکوٰۃ کی شرحیں، یہ ختنہ، یہ نکاح و طلاق و وراثت کے قاعدے، یہ حرام و حلال کے ضابطے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دوسرے بہت سے اصول اور طور طریقے جس روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیے اسی روز سے وہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھ گئیں۔ اور پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اسی طرح پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں جس طرح ان کی ایک نسل سے دوسری نسل قرآن پڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ہماری تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ رسولِ پاک کی جن سنتوں پر قائم ہے ان کے صحیح ہونے کا ثبوت بعینہٖ وہی ہے جو قرآن پاک کے محفوظ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے۔

پھر دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے عہد کی سوسائٹی کا کیسا مفصل نقشہ، کیسی جزئی تفصیلات کے ساتھ کیسے مستند ریکارڈ کی صورت میں آج ہم کو مل رہا ہے۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک قول و فعل کی سند موجود ہے جس کو جانچ کر ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روایت کہاں تک قابلِ اعتماد ہے۔ صرف ایک انسان کے حالات معلوم کرنے کی خاطر اس دور کے کم و بیش ... لاکھ انسانوں کے حالات مرتب کر دیئے گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاکہ ہر وہ شخص جس نے کوئی روایت اس انسانِ عظیم کا نام لیکر بیان کی ہے اس کی شخصیت کو پرکھ کر رائے قائم کی جاسکے کہ ہم اس کے بیان پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تاریخی تنقید کا ایک وسیع علم انتہائی باریک بینی کے ساتھ صرف اس مقصد کے لیے مدوّن ہو گیا کہ اس ایک فردِ فرید کی طرف جو بات بھی منسوب ہو اسے ہر پہلو سے جانچ پڑتال کر کے صحت کا اطمینان کر لیا جائے۔ کیا دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی اور مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ کسی ایک شخص کے حالات محفوظ کرنے کے لیے انسانی ہاتھوں سے یہ اہتمام عمل میں آیا ہو؟ اگر نہیں ملتی اور نہیں مل سکتی، تو کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے؟

وحی سے مراد کیا چیز ہے؟

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:

> "قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنیٰ ہو رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورۂ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟"

یہ ایسا مہمل سوال آپ نے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ آخر یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اس معنی میں ہیں کہ آپ نے تفسیر بیضاوی یا جلالین کی طرح کی کوئی تفسیر لکھی تھی جس میں قرآن کے عربی الفاظ کی تشریح میں کچھ دوسرے مترادف عربی الفاظ درج کر دیئے تھے اور ان تفسیری فقروں کو اب کوئی شخص "وحی منزل اللہ" کہہ رہا ہے۔ جو بات آپ سے بار بار کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبر کی حیثیت سے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے وہ بربنائے وحی ہے۔ آپ کا پورا پیغمبرانہ کارنامہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں نہ تھا بلکہ خدا کے نمائندۂ مجاز ہونے کی حیثیت میں تھا۔ اس حیثیت میں آپ کوئی کام بھی خدا کی مرضی کے خلاف یا اس کے بغیر نہ کر سکتے تھے۔ ایک معلم، ایک مربی، ایک مصلحِ ... ایک مدیرِ تہذیب و تمدن، ایک قاضی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مُعلّم، ایک مدبر، ایک سپہ سالار، ایک حکمران کی حیثیت میں آپ نے جتنا کام بھی کیا وہ سب دراصل خدا کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام تھا۔ اس میں خدا کی وحی آپ کی رہنمائی اور نگرانی کرتی تھی، اور کہیں ذرا سی چوک بھی ہو جاتی تو خدا کی وحی بروقت اس کی اصلاح کر دیتی تھی۔ اس وحی کو اگر آپ اس معنی میں لیتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی تشریح میں کچھ عربی زبان کے مترادف الفاظ نازل ہو جاتے تھے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ " بریں عقل و دانش بباید گریست "۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وحی لازماً الفاظ کی صورت ہی میں نہیں ہوتی۔ وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈالا جائے۔ وہ ذہن و فکر کے لیے ایک رہنمائی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک معاملہ کا صحیح فہم بخشنے اور ایک مسئلے کا ٹھیک حل یا ایک موقع کے لیے مناسب تدبیر سجھانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ محض ایک روشنی بھی ہو سکتی ہے جس میں آدمی اپنا راستہ صاف دیکھ لے۔ وہ ایک سچا خواب بھی ہو سکتی ہے۔ اور وہ پردے کے پیچھے سے ایک آواز یا فرشتے کے ذریعہ سے آیا ہوا ایک پیغام بھی ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں لفظ وحی کے معنی " اشارۂ لطیف " کے ہیں۔ انگریزی میں اس سے قریب تر لفظ (INSPIRATION) ہے۔ اگر آپ عربی نہیں جانتے تو انگریزی زبان ہی کی کسی لغت میں اس لفظ کی تشریح دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ لفظ کے مقابلہ میں مترادف لفظ رکھنے کا یہ عجیب و غریب تصور، جسے آپ وحی کے معنی میں لے رہے ہیں، کیسا طفلانہ تصور ہے۔

آپ کا پانچواں سوال یہ ہے:

" بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۴ میں آگیا ہے۔ اور وہ عقیدہ جو میں نے اوپر بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہے ۔ وہ "بعض لوگوں" کا نہیں بلکہ آغازِ اسلام سے آج تک تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

محض تکرارِ سوال | آپ کا چھٹا سوال یہ ہے:

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضور کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہ تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضور کے جو ارشادات وحی تھے ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے مسلمانوں کے لیے ایمان و طاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟"

اس سوال کے پہلے حصے میں آپ نے اپنے سوال نمبر ۳ کو پھر دُہرا دیا ہے اور اس کا جواب وہی ہے جو اوپر اسی سوال کا دیا جا چکا ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے اس بات کا اعادہ کیا ہے جو اس سے پہلے اپنے خط نمبر ۲ میں آپ بیان فرما چکے ہیں اور میں اس کا جواب عرض کر چکا ہوں[1]۔ شبہ ہوتا ہے کہ آپ میرے جوابات کو غور سے پڑھتے بھی نہیں ہیں اور ایک ہی طرح کے سوالات کو دُہراتے چلے جاتے ہیں۔

ایمان و کفر کا مدار | آپ کا ساتواں سوال یہ ہے:

"اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہدے کہ وہ "منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے، یعنی بالفاظِ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں اور امت کا ان پر اجماع

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۴۳-۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کرے گا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہوگا۔ دوسری قسم کی سُنّتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سنّتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق میں فلاں سنّت ثابت نہیں ہے اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم علمی حیثیت سے اس کی رائے کو صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ یہ واقعی سنّتِ رسول ہو بھی تو میں اس کی اطاعت کا پابند نہیں ہوں، تو اس کے خارج از اسلام ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ وہ رسول کی حیثیت حکمرانی (AUTHORITY) کو چیلنج کرتا ہے جس کی کوئی گنجائش دائرہ اسلام میں نہیں ہے۔

کیا احکامِ سنّت میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے؟ آپ کا آٹھواں سوال یہ ہے:-

"رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا ردّ و بدل قرآن کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی احکام کے جزئیات ہوں یا ثابت شدہ سنّتِ رسولؐ کے کسی حکم کے جزئیات، دونوں کے اندر صرف اسی صورت میں اور اسی حد تک ردّ و بدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ کسی ردّ و بدل کی گنجائش دیتے ہوں، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام میں ردّ و بدل کی اجازت دیتی ہو۔ اس کے ماسوا کوئی مومن اپنے آپ کو کسی حال میں بھی خدا اور رسول کے احکام میں ردّ و بدل کر لینے کا مختار و مجاز تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جو اسلام سے نکل کر مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہی ہے کہ پہلے رسول کو آئین و قانون سے بے دخل کر کے "قرآن بلا محمدؐ" کی پیروی کا نرالا مسلک ایجاد کریں، پھر قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کی ایسی من مانی تاویلات شروع کر دیں جنہیں دیکھ کر شیطان بھی اعتراف کمال پر مجبور ہو جائے۔

خاکسار: ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۶۰ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخری خط اور اُس پر تبصرہ

[ذیل میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری عنایت نامہ درج کیا جارہا ہے جو ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو انہوں نے ارسال فرمایا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر ہر صاحبِ ذوقِ سلیم یہ سوال کرے گا کہ اس تحریر کو شائع ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن جس مقصد کی خاطر اس گندگی میں ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ منکرینِ حدیث کے سارے دلائل و مسائل ان کی اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور ان کا واضح جواب دیکر اس گمراہی کا سدِباب کر دیا جائے جو یہ لوگ عوام اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں پھیلا رہے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ خط یہاں جوں کا توں درج کیا جارہا ہے تاکہ منکرینِ حدیث اپنے دلائل اور اپنے اخلاقی فضائل دونوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائیں۔ یہ خط جس انداز میں لکھا گیا ہے اس کی بنا پر جواب میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنا تو پسند نہیں کیا گیا البتہ اس میں جو جو باتیں قابلِ لحاظ اور زیرِ بحث مسائل سے متعلق ہیں ان سب کا جواب ناظرین کی تشفی کے لیے حواشی میں دے دیا گیا ہے تاکہ ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا چلا جائے۔

اس خط کے معاملہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت کا ایک عجیب مظاہرہ یہ بھی فرمایا ہے کہ پچھلی تمام مراسلت کو چھوڑ کر تنہا یہی ایک خط پہلے "چٹان" میں، اور پھر اپریل ۱۹۶۱ء کے "طلوعِ اسلام" میں شائع کرا دیا، حالانکہ ابتداءً انہوں نے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس سلسلے کی پوری مراسلت شائع فرمائیں گے۔ اس طرح کی باتیں دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کتنی ہی معیوب ہوں، منکرینِ حدیث کے تو شایانِ شان ہی ہیں۔]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باسمہٖ سبحانہٗ

مولانائے محترم ۔ السلام علیکم ۔ آپ کا آخری خط مجھے مل گیا تھا ۔ تکلیف فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں ۔ میرے سامنے اس وقت وہ چاروں رسائل ہیں جن میں آپ نے اس خط و کتابت کو شائع فرمایا ہے یعنی ترجمان القرآن بابت جولائی و اکتوبر و نومبر و دسمبر ۱۹۶۰ء ۔

۱ ۔ اس خط میں میرا مقصد ان الجھنوں کا بیان کرنا ہے جو آپ کے اس قدر طول طویل جوابات نے پیدا کر دیں بلکہ بڑھا دی ہیں ۔ اور ان غلطیوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو قرآن کریم کو سمجھنے میں آپ سے سرزد ہوتی ہیں ۔ اور جن کی وجہ سے (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) آپ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں ۔ اور اس کے ساتھ ان عوام الناس کا بھی جو آپ کی وجہ سے گمراہ ہو رہے ہیں ۔ ان بیچاروں کی حالت اور بھی زیادہ قابلِ رحم ہے ۔ اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں سے اگر دین کا سر رشتہ چھوٹتا ہے تو کم از کم دنیاوی مفاد تو حاصل ہو گئے ہیں ۔ ان بیچاروں کا دین اور دنیا دونوں میں خسران ہے ۔

۲ ۔ قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف آؤں دو ایک | بزمِ طلوعِ اسلام سے تعلق ؟ |
باتیں نکلے کے طور پر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ آپ نے اس خط و کتابت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے ۔

" ذیل میں وہ مراسلت درج کی جا رہی ہے جو " بزم طلوع اسلام " کے ایک نمایاں فرد ڈاکٹر عبد الودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کے درمیان سنت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوتی ہے " (ترجمان جولائی صفحہ ۲۱۹)

اس کے بعد آپ نے اسی اشاعت کے صفحہ ۲۴۷ پر لکھا ہے کہ :

" میں ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا ۔ مگر یہ شاید بزمِ طلوعِ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا

چند سطریں آگے چل کر آپ نے لکھا ہے :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"آپ بھی اس خط و کتابت کو "طلوع اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں۔ تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں"۔

میں نے اپنے خط مورخہ ۱۳ جولائی میں وضاحت سے آپ کو لکھ دیا تھا کہ

"یہ حقیقت شاید آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو کہ میں بزم طلوع اسلام کا "اہم فرد" تو درکنار اس کا ابتدائی یا معمولی رکن تک نہیں۔ ہاں البتہ طلوع اسلام کے لٹریچر سے متاثر ضرور ہوں۔ بالخصوص اس کے اس حصے سے جس میں اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس موضوع سے مجھے گہری فکری و نظری دلچسپی رہی ہے اس لیے اس موضوع کے ہر گوشے کا کماحقہ تعارف حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس معاملہ میں آپ کے لٹریچر سے بھی حتی الوسع مستفید ہونے کی پوری کوشش کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اس کے بعد ایک دوسرے خط میں یہ بھی تاکیداً لکھا تھا کہ آپ اس وضاحتی خط کو شائع کریں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس خط کو شائع نہیں کیا بلکہ مزید شائع شدہ خط و کتابت میں اس کا اشارۃً تک نہیں کیا۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا تھا کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور معذرت چاہتے[1]۔ یہ آپ کی پرانی تکنیک ہے کہ جن لوگوں

---

[1] ڈاکٹر صاحب کی اس شکایت کا جواب خود طلوعِ اسلام کے صفحات میں کسی اور کی زبانی نہیں بلکہ جناب پرویز صاحب کی زبان سے سننا زیادہ بہتر ہوگا۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰ اپریل سنہ ۶۰ء کو لاہور میں طلوعِ اسلام کنونشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی تقریر سے پہلے پرویز صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ہمارے لیے باعثِ فخر ہے ۔ ۔ ۔ اور ان کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ یہ [illegible] قرآنی [illegible] اس کے ہر لیکچر کا ایک ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے آپ کو کوئی اختلاف ہو اور ان کے سوالات کا جواب آپ سے بن نہ پڑے تو آپ ان کے خلاف الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے خلاف آپ کے عقیدتمندوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں اور وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

کیا گشتی سوالنامے کا مقصد علمی تحقیق تھا؟ ۳۔ آپ نے یہی سیاسی حربہ آگے چل کر بھی استعمال فرمایا ہے۔ جہاں آپ لکھتے ہیں "آپ نے یہ مراسلت واقعی بات سمجھنے کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ لیکن آپ کی تو سکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے۔ اور پھر ان کا مجموعہ شائع کر کے یہ پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنت کے بارے میں ایک متفقہ رائے نہیں رکھتے"۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۰ء)

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میری اس "سکیم" کا علم کیسے ہوا؟ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ میری نیت وہی تھی جسے آپ میری طرف منسوب کر رہے ہیں؟

حرف ضبطِ تحریر میں سے آئے ہیں۔ یہ کام بڑی صبر آزما مشقت کا طالب تھا جسے یہ اس حسن مسرت سے سرانجام دے رہے ہیں"۔ (طلوع اسلام مئی، جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۵)۔

اب اگر ڈاکٹر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ میں بزم طلوعِ اسلام کا ابتدائی رکن بھی نہیں ہوں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گاندھی جی فرماتے تھے کہ میں کانگرس کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہوں۔ ہر شخص جو طلوع اسلام کی تبلیغ سے واقف ہے اس مراسلت کو پڑھ کر خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے طلوع اسلام ہی بول رہا ہے یا کوئی اور۔

لہ آدمی کی نیت کا براہ راست علم تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ انسان جس چیز سے کسی شخص کی نیت کا اندازہ کر سکتا ہے وہ یا تو اس شخص کا عمل ہے یا ان لوگوں کا مجموعی طرز عمل ہے جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیشک میں نے ان سوالات کو متعدد حضرات کے پاس بھیجا تھا اس لیے کہ میرے نزدیک یہ مسائل اتنے اہم تھے کہ میں ان کے متعلق ہر گوشے سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں یہی کوشش اب بھی جاری رکھونگا کہ دوسرے علماء سے اپنے سوالات کا جواب لوں۔ گو میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے سوا کسی دوسرے صاحب میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوئی کہ وہ میرے سوالات کو شائع ہی کر دے خواہ اس کے بعد جوابات ایسے ہی بے تکے دے جیسے آپ نے دیئے ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آئین کمیشن کو جو "متفقہ" جواب نامہ بھیجا گیا تھا اس کے مصنف آپ تھے۔ اور باقی سب جی حضوریئے تھے۔

کیا سنت رسولؐ کے مفہوم و معنی میں علماء کے درمیان اختلاف ہے؟

باقی رہی یہ حقیقت کہ سنت کے بارے میں آپ حضرات کوئی متفقہ رائے نہیں رکھتے تو یہ کونسی ایسی بات تھی جس کے لیے مجھے مختلف علماء کی آراء دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی آراء لوگوں کے سامنے ہیں۔ اور ان کے اختلاف سے بھی دنیا واقف ہے۔ مثال کے طور پر آپ بھی سنت کے بہت بڑے مدعی ہیں اور جماعت اہل حدیث کا تو مسلک ہی یہی ہے۔ لیکن سنت کی تفاصیل تو کجا۔ سنت کسے کہتے ہیں؟ اس کے متعلق جمعیت اہلِ حدیث کے ناظم کا ارشاد یہ ہے:

"میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ اور ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔" (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۱۱)

کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب مخالفینِ سنت کے جس گروہ سے تعاون کر رہے ہیں وہ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے کے لیے لگا رہا ہے کہ سنت ایک مشتبہ اور مختلف فیہ چیز ہے۔ اس غرض کے لیے جس طرز کا پروپیگنڈا ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے اس پر طلوعِ اسلام کے صفحات اور اس ادارے کی مطبوعات شاہد ہیں۔ ان کاموں کو دیکھ کر یہ رائے مشکل ہی سے قائم کی جا سکتی ہے کہ اسی گروہ کے ایک ممتاز فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی طرف سے [illegible] سوالنامہ بھیجا گیا تھا وہ خالص علمی تحقیق کی خاطر تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "وہ آپ کے نظریہ کی آخری حد تک مزاحمت کرینگے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کرینگے" (ایضاً صفحہ ۶۳)

احادیث کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ

"بخاری اور مسلم کی صحت پر امت متفق ہے۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۵)

اور انہی احادیث کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیے" (ترجمان القرآن اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

فرما دیجئے کہ اس کے بعد یہ بتانے کے لیے کہ آپ حضرات میں اس بارے میں کتنے اختلافات ہیں میرے کسی پروپیگنڈے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟[1] آپ کو کسی کی نیت پر حملہ کرنے سے پہلے کچھ تو جھجک محسوس کرنی چاہیے۔

تہمتِ بے جا ۴۔ آخری خط میں آپ پوچھتے ہیں کہ

"آخر وہ کونسا بت ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس شخصیت پرستی کی آپ کو دعوت دی گئی تھی" (ترجمان۔ دسمبر ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۱۷۶)

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے اوپر جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ صرف اس بات کی ایک عبرتناک مثال ہیں کہ بعض علماء کی طرف سے اختلافی بحثوں میں جو بے اعتدالی برتی جاتی ہے وہ کس طرح گمراہی پھیلانے والوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار فراہم کر دیتی ہے لیکن اس طرح کے اقتباسات سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بجائے خود ماخذ قانون ہونا علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ یا سنت رسول کی اصطلاح کے معنی و مفہوم میں ان کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف ہے۔ میں نے اس مراسلت میں سنت کی آئینی حیثیت اور اصطلاح سنت کے مفہوم پر جو کچھ عرض کیا ہے اسے کسی حنفی یا اہل حدیث یا شیعہ عالم کے سامنے رکھ کر دیکھ لیا جائے معلوم ہو جائیگا کہ ان بنیادی امور میں مسلمانوں کے درمیان پورا اتفاق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بُت کی تلاش میں آپ کو کسی مندر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بُت آپ خود ہی ہیں۔ آپ کی زبان اور قلم سے جو کچھ نکل جاتا ہے اسے آپ خدا اور رسولؐ کا فرمان قرار دیتے ہیں۔ اس کے سامنے جھکنا حق کے سامنے جھکنا ہے۔ اور آپ کے نزدیک اس سے انحراف خدا اور رسول سے انحراف کے مرادف ہے۔ جو آپ سے اختلاف کرے اس کے خلاف آپ اور آپ کے حاشیہ بردار جو کچھ کرتے ہیں ایک دنیا اس کی شاہد ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ برسوں تک آپ کے معتقد رہے اور اس کے بعد ان بیچاروں نے آپ کی کسی بات سے اختلاف کیا تو آپ حضرات نے جو کچھ ان کے خلاف کیا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ یہی وہ آپ کا بُت ہے جس کے سامنے جھکنے کے لیے آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ اور میرے نہ جھکنے پر مجھے خدا اور اس کے رسولؐ سے منحرف ہو جانے کے جرم عظیم کا مرتکب قرار دے رہے ہیں[1]۔

اے کاش کہ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا کہ آپ کی اس روش نے سنجیدہ طبقے کی نگاہوں میں آپ کا وقار کس قدر کھو دیا ہے۔

کتابت کی غلطی اور جہالت کی غلطی کا فرق | ۵۔ آپ نے میرے خطوط میں سے بعض کتابت کی غلطیوں کو اچھال کر یہ تأثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں قرآنی آیات کی صحیح املا تک نہیں جانتا۔ مجھے اپنی علمی حدود کا اچھی طرح سے علم ہے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ آپ نے جو بات کہی ہے وہ کس قدر گھٹیا درجے کی ہے۔ میرے خطوط کی کتابت کسی اور صاحب نے کی تھی۔ کتابت میں عام طور پر جو غلطیاں رہ جاتی ہیں اس کا کسے علم نہیں۔ مجھے اگر آپ کی اس ذہنیت کا علم ہوتا تو میں ان آیات کو خود ٹھیک کر لیتا۔ اس کا تو آپ کو بھی تجربہ ہو گا۔ کہ آپ کی اتنی علمیت اور احتیاط کے باوجود خود آپ کی

---

[1] پچھلے صفحات میں اس مراسلت کو جن حضرات نے بغور ملاحظہ فرمایا ہے وہ خود ہی تلاش کر کے دیکھیں کہ اس ساری گفتگو میں میرا بت کہاں [illegible] شخصیت کی پرستش کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابوں میں کتابت کی کتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کیا ان غلطیوں کی بنا پر آپ کو جاہل قرار دے دیا جائے؟[۵]

مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہید میں یہ کچھ لکھنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی میرا مقصد یہ ہے کہ شاید اس سے آپ اپنی اصلاح فرما سکیں۔ اپنے عقیدتمندوں کے ساتھ میں رہنے والوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ اُن میں سے انہیں کوئی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کرتا کہ ع

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی غیر جانبدار آگے بڑھ کر ان کے سامنے آئینہ رکھدے جس میں انہیں اپنے حقیقی خط و خال نظر آجائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینے میں اپنے بھیانک خط و خال دیکھ کر آئینے کو پتھر پر دے مارا تھا۔ اس انکشافِ حقیقت سے گالیوں پر اتر آئے۔

"جواب نہیں ملا" کی تکرار ۶۔ میں نے اپنے سوالات کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مملکت پاکستان کے لیے اسلامی آئین مرتب کرنے کے سلسلہ میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس آئین کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی جانی چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہ رہنے پاتے۔ نہ بننے پائے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس مقصد کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ جس طرح قرآن کے متعلق ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ ایک متعین کتاب کا نام ہے جس میں پہلے لفظ سے آخری لفظ تک جو

[۵] کسی صاحب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ کتابت کی غلطی اور جہالت کی غلطی میں کیا فرق ہے کاتب جو غلطیاں کرتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن غلطیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جو خود مصنف کرتا ہے اور گرفت ہونے پر کاتب کے سر تھوپتا ہے۔ مخالفین سنت کی یہ عام بیماری ہے کہ ان کے اکابر و اصاغر قرآن مجید کی آیات کا صحیح تلفظ تک نہیں کر سکتے اور اس پر ان کا زعم یہ ہے کہ قرآن کو اُن کے سوا کسی نے نہیں سمجھا۔ یہی غلط زعم ان حضرات کو اپنے علم کی کمی کا اعتراف کرنے سے روکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ درج ہے حرفاً حرفاً خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح یہ بھی متعین طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسے کہتے ہیں؟ اور وہ کس جگہ اس شکل میں مل سکے گی۔ کہ اس کے متعلق متفق علیہ طور پر کہا جا سکے کہ وہ حرفاً حرفاً سنت رسول اللہ ہے۔ تاکہ جب یہ سوال پیدا ہو کہ فلاں فلاں قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے یا نہیں تو اس وقت یہ بحث نہ شروع ہو جائے کہ صحیح سنت رسول اللہ ہے کیا۔

آپ نے اس کے جواب میں اپنی ہمہ دانی اور مستفسر کی "جہالت" کے متعلق بیسیوں صفحات سیاہ کر ڈالے لیکن ان سوالات کے متعلق جو کچھ کہا وہ اس سے زیادہ کیا ہے کہ ان کا جواب آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس پر مجھے بے ساختہ اس لال بجھکڑ کی بات یاد آرہی ہے کہ جس کے گاؤں سے ایک دفعہ ایک ہاتھی گزرا۔ اس کے عقیدت مندوں کا حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا تھا جو گزرا؟ یہ سن کر لال بجھکڑ صاحب زار و قطار رونے لگ گئے۔ انہیں دیکھ کر عقیدت مند بھی آنسو بہانے لگے۔ جب کچھ سکون ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ حضور آپ کے رونے کا باعث کیا تھا؟ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ مجھے رونا اس بات پر آگیا کہ اب تو تمہاری یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی مشکل بات سامنے آگئی آپ لوگ دوڑ کر میرے پاس آگئے اور اطمینان کر لیا۔ کل جب میں نہیں ہوں گا تو تمہیں یہ باتیں کون بتایا کرے گا۔ اس پر عقیدتمندوں کا حلقہ پھر رونے لگ گیا۔ سکون ہوتے پر انہوں نے پوچھا کہ حضرت! اب فرمائیے کہ یہ کیا تھا جو گزرا؟ لال بجھکڑ صاحب نے جواباً فرمایا کہ اس کا تو مجھے بھی علم نہیں کہ یہ کیا تھا۔ آپ میں اور اس لال بجھکڑ میں فرق یہ ہے کہ اس میں اپنی لاعلمی کے اعتراف کی جرأت تھی لیکن آپ اسے طومار نویسی کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عقیدت مندوں کے حلقے میں آپ کا بھرم قائم رہے

عبارتوں میں شرمناک قطع و برید | میرا پہلا سوال یہ تھا کہ سنت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے سیدھی صاف اور دو ٹوک بات کہنے کے بجائے جو کچھ بیسیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صفحات میں لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی تیئیس ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ واجب الاتباع سنت ہے۔ لیکن جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے فرمایا یا عملاً کیا، وہ واجب الاتباع سنّت نہیں۔ یعنی آپ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے رسول ہونے اور انسان ہونے کی حیثیتوں میں فرق کیا ہے۔ (ترجمان بابت جولائی سنہ ۶۰ء)۔ میری مشکل یہ ہے کہ آپ دوسرے مقام پر خود اس کے خلاف لکھتے ہیں۔ آپ نے مولانا اسلم جیراج پوری (مرحوم) کی کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا: "لیکن یہ تفریق جو انہوں نے محمد ابن عبد اللہ (بحیثیت انسان) اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلّغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ انسانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ حتیٰ کہ آپ کے نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے تمام معاملات بھی اس حیثیت کے تحت آگئے تھے؎ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ میں؎ کہتا ہوں کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی

؎ اس کے بعد ایک پورا فقرہ ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور آگے کی عبارت اس طرح نقل کی ہے جس سے شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی عبارت چھوڑی گئی ہے۔

؎ بیچ میں پورے ڈیڑھ صفحہ کی عبارت چھوڑ کر یہ فقرہ آگے کے ایک مقام سے نقل کیا گیا ہے مگر کوئی علامت یہاں بھی ایسی نہیں دی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس جگہ کوئی چیز چھوڑی گئی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے میں ان چھوٹے ہوئے فقروں کو نقل نہیں کرتا۔ میری کتاب "تفہیمات" ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس موجود ہے۔ وہ اس کا مضمون "اتّباع و اطاعتِ رسول" خود نکال کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ایک شخص کے سامنے خود اس کی اپنی تحریروں کو قطع و برید کے ساتھ پیش کرنے سے نہیں چوکتے وہ دوسروں کو دھوکا دینے میں کتنے کچھ بے باک ہونگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت سے کرتے تھے۔" (تفہیمات حصہ اول صفحات نمبر ۲۴۱-۲۴۲)

رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی | یعنی اُس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا کہ قرآن میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر حضور کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور اب آپ فرماتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے رسول کی حیثیت سے کیا تھا وہ سنت واجب الاتباع ہے۔ اور جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے کیا تھا وہ واجب الاتباع سنت نہیں ہے[1]۔ اس باب میں آپ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "جو امور آپ نے عادتاً کیے ہیں

---

[1] اسی مراسلت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب اس بحث کو پہلے چھیڑ چکے ہیں اور ان کو اس کا جواب دیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۴۳-۴۴)۔ لیکن جب کوئی شخص بات کو نہ سمجھنا چاہے اور صرف بحث برائے بحث کیے چلا جائے تو اس کو سمجھانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا مضمون "رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی" مندرجہ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۹ء ملاحظہ فرمالیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے اس کو پڑھا نہیں یا سمجھا نہیں۔ اس میں پوری وضاحت کے ساتھ میں نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے وہ آپ کے کسی ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ آپ کو اس نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس لحاظ سے باعتبار نظریہ تو آپ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں فرق ہے لیکن عملاً چونکہ ایک ہی ذات میں شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں جمع ہیں اور ہم کو آپ کی اطاعت کا مطلق حکم دیا گیا ہے، اس لیے ہم بطور خود یہ فیصلہ کر لینے کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم حضور کی فلاں بات مانیں گے کیونکہ وہ بحیثیت رسول آپ نے کی یا کہی ہے، اور فلاں بات نہ مانیں گے کیونکہ وہ آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کام خود حضور ہی کا تھا کہ شخصی نوعیت کے معاملات میں آپ نہ صرف لوگوں کو آزادی عطا فرماتے تھے بلکہ آزادی برتنے کی تربیت بھی دیتے تھے۔ اور جو معاملات رسالت سے تعلق رکھتے تھے ان میں آپ بے چون و چرا اطاعت کراتے تھے۔ اس معاملہ میں ہم کو جو کچھ بھی آزادی حاصل ہے وہ رسول پاک کی دی ہوئی آزادی ہے جس کے اصول اور حدود حضور نے خود بتا دیئے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں سنّت بنا دیتا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرتا کہ وہ سب ان عادات کو

یہ ہماری خود مختارانہ آزادی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بات کو مزید واضح کرنے کے لیے میں نے عرض کیا تھا:

"جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا، پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفعِ حاجت وغیرہ۔ وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے ... مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپؐ کے کھانے پینے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپؐ ایک خاص وضع قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپؐ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپؐ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور ان کے انتخاب میں بھی آپؐ کے اپنے ذوق کا دخل تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں آپؐ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے، جس کی تعلیم دینے کے لیے آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ عمل میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش تراش اور وضع قطع پر سلوائیں اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں۔ البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرہ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملہ میں حرام اور حلال، اور جائز اور ناجائز کے حدود متعین کرے اور لوگوں کو اُن آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

←

© rasailojaraid.com

اختیار کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے":
(رسائل و مسائل صفحہ ۳۰۰)

اس سے ذرا آگے چل کر آپ نے تحریر فرمایا ہے:

"میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے" (ایضاً صفحہ نمبر ۳۰۸)

تعلیماتِ سنت میں مراتب کا فرق اور اس کی حقیقت ۷۔ پھر جن باتوں کے متعلق آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ نے انہیں بحیثیتِ رسولؐ ارشاد فرمایا یا کیا تھا ان کے اتباع میں بھی آپ فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے:

"جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے

← اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے آخری بات جو میں نے لکھی تھی وہ یہ ہے:

"حضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے وہ عنداللہ اور عندالرسول ہے۔ اور ہمیں اس سے اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمدؐ بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاعِ حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمدؐ بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمدؐ رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمدؐ رسول اللہ ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمدؐ رسول اللہ ہی نے دی ہے":

ان عبارات کو جو شخص بھی ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر پڑھے گا وہ خود رائے قائم کرے گا کہ ڈاکٹر صاحب حسن الظن میں پڑھے ہوئے ... [illegible] ... ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل۔ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے۔ یا جن سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہمیں مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے۔ اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔[۹]

۹؎ اس عبارت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سنت سے جو تعلیمات ہم کو ملتی ہیں وہ سب ایک ہی درجے اور مرتبے کی نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان فرقِ مراتب ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خود قرآن مجید کی تعلیمات میں بھی فرقِ مراتب ہے۔ ہدایت کے ان دونوں سرچشموں سے جو کچھ ہمیں ملا ہے وہ سب ایک ہی درجے میں فرض و واجب نہیں ہے۔ نہ ہر حکم کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ کو جوں کا توں ہر حال میں نافذ کیا جائے۔ مثال کے طور پر خود قرآن میں دیکھیے کہ ایک طرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمایا گیا ہے جو یقیناً فرض و واجب ہے۔ لیکن اسی طرح کے صیغۂ امر میں فرمایا فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اور وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ یہ دونوں ارشادات صیغۂ امر میں ہونے کے باوجود صرف اباحت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر بحث کی خاطر یہ گفتگو نہ کر رہے ہوتے تو ان کے لیے بات کو سمجھنا اس قدر مشکل نہ تھا۔ "تفہیمات" کے جس مضمون (رسالت اور اس کے احکام) سے یہ عبارت انہوں نے نقل کی ہے اس کو نکال کر پڑھیے۔ اس میں اس عبارت سے متصل ہی یہ الفاظ موجود ہیں: ←

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق براہِ راست دین اور شریعت سے ہے۔ لیکن تمدنی معاشی اور سیاسی معاملات کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں؎۔ اور دوسری طرف آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ

"پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیے، اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہییں، اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہییں۔"

میں ناظرین سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ میری یہ کتاب فراہم کر سکیں تو اس پورے مضمون کو ملاحظہ فرمائیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن کی وہ اصل کیفیت ان کے سامنے بے نقاب ہو جائے جس کے زیر اثر انہوں نے ٹھیک اسی مضمون میں اپنی الجھن کا سامان تلاش کیا ہے جو ان کی بیشتر الجھنوں کو رفع کر سکتا تھا۔ البتہ اس مضمون کو پڑھتے وقت یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اس میں جن پرویز صاحب کا ذکر ہے وہ ۱۹۳۶ء کے پرویز صاحب ہیں نہ کہ آج کے۔ اس وقت وہ گمراہی کے بالکل ابتدائی سرے پر تھے اور آج معاملہ فی ضلال بعید سے گزر کر ضلالت کی پیشوائی تک پہنچ چکا ہے۔

؎ اس جگہ میری عبارت میں بعض امور کے دین سے براہِ راست متعلق ہونے اور بعض کے براہِ راست متعلق نہ ہونے کا جو ذکر آیا ہے اسے پورے مضمون سے الگ نکال کر ڈاکٹر صاحب یہ غلط معنی پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں سیاسی و تمدنی اور معاشی مسائل کو دین سے قطعاً غیر متعلق قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ جن امور کو میں نے دین سے براہِ راست متعلق قرار دیا ہے ان سے میری مراد وہ عبادات ہیں جنہیں شارع نے "ارکانِ اسلام" کی حیثیت دی ہے، یعنی نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ۔ دوسری طرف جن امور کو میں نے کہا ہے کہ وہ دین سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں ان سے مقصود ارکانِ اسلام کے ماسوا دوسرے امور ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اقامتِ دین سے مراد ہی اسلام کے مطابق تمدنی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا ہے۔"

حیرت ہے کہ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر اقامتِ دین سے مراد ان امور سے متعلق نظام قائم کرنا کیسے ہو گا؟

علمی تحقیق یا جھگڑالو پن؟ اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجیے کہ آئینِ مملکت میں جن امور سے بحث ہو گی ان کا تعلق ملک کے تمدنی۔ معاشی۔ معاشرتی مسائل سے ہو گا۔ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر آئینِ مملکت کے دینی یا غیر دینی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اگر ان امور میں سنت رسول اللہ کا اتباع اس نوعیت کا نہیں جس نوعیت کا اتباع ان امور میں ضروری ہے جو (بقول آپ کے) براہِ راست دین سے متعلق ہیں مثلاً نماز۔ روزہ وغیرہ) تو پھر ان کے متعلق یہ سوال بھی کیا اہمیت رکھے گا کہ یہ سنت کے مطابق ہیں یا نہیں؟[11]

کہ وہ دین سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اگر وہ واقعی غیر متعلق ہوتے تو ان کے متعلق قرآن و سنت میں شرعی احکام پائے ہی کیوں جاتے۔

[11] ڈاکٹر صاحب میری جس عبارت سے یہ نتائج نکال رہے ہیں اس کے صرف دو فقروں (دین سے "براہِ راست تعلق ہے" اور "براہِ راست تعلق نہیں ہے") کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور انہی پر اپنے تخیلات کی ساری عمارت تعمیر کرنی شروع کر دی ہے۔ حالانکہ خود اسی عبارت میں اُن کے ان نتائج کی تردید موجود ہے۔ اُس میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہے کہ دوسری قسم کے معاملات میں مختلف مدارج کی تعلیمات ہم کو حضورؐ سے ملی ہیں۔" ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے بعض ایسی ہیں . . . . . " کیا ان فقروں سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ جن کاموں کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے منع فرمایا ہے ان کے بارے میں حضورؐ کے فرمان کی خلاف ورزی کرنا جائز ہے؟ یا حضورؐ کی دوسری ہدایات نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

رہے وہ الفاظ جن سے آج ڈاکٹر صاحب [illegible] نے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۸۔ میں نے آپ کے جو اقتباسات اوپر نقل کیے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک

ا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ہر سانس میں جہاں اور جس حال میں بھی کچھ کیا یا فرمایا وہ بحیثیتِ رسالت تھا۔ اور قرآن نے آپ کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔

۲۔ حضورؐ کی شخصی حیثیت الگ تھی اور رسالت کی حیثیت الگ۔ سنت واجب الاتباع وہ ہے جو آپ نے رسالت کی حیثیت سے کیا یا فرمایا۔

۳۔ جو کچھ آپ نے بحیثیتِ رسالت کیا یا فرمایا اس کے بھی دو حصے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے مثلاً نماز، روزہ۔ ان کی اطاعت طابق النعل بالنعل کی جائے گی دوسرے وہ امور جن کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں مثلاً سیاسی امور۔ ان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے میرا ذہنِ ناقص سمجھ نہیں سکا لیکن اتنا بہرحال ظاہر ہے کہ ان کی اطاعت

قابلِ ذکر ہے کہ اب سے بہت پہلے میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کوئی فتنہ پرداز انہیں غلط معنی پہنا سکتا ہے چنانچہ تفہیمات حصہ اول کے پانچویں ایڈیشن (ستمبر ۱۹۴۹ء) کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں اور اس کے بعد کے تمام ایڈیشنوں میں ان کے بجائے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں: "جو امور فرائض و واجبات اور تقالیدِ شرعیہ کی نوعیت رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں" یہ اصلاح میں نے اسی لیے کی تھی کہ تمدنی و معاشی اور سیاسی معاملات کو دین سے غیر متعلق سمجھنے کا خیال، جو میرے سابق الفاظ سے نکالا جا سکتا تھا، رفع ہو جائے۔ مزید براں ایک مضمون کا پورا مدعا صرف اس کے دو فقروں سے تو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پورے مضمون کو کوئی شخص پڑھے تو اس پر واضح ہو جائے کہ اُس کا مدعا اس مطلب کے بالکل خلاف ہے جو ڈاکٹر صاحب اس کے دو فقروں سے نکال رہے ہیں۔ تحقیق کی خاطر جو شخص بحث کرتا ہے وہ آدمی کی پوری بات سُن کر اس کے مجموعی مفہوم پر کلام کیا کرتا ہے۔ کہیں سے ایک دو لفظ پکڑ کر ان کو کھینچنا محض جھگڑالو پن ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اللہ کی طرح نہیں کی جائے گی)

۹ | رسول کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کا اصول اور طریقہ یہ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں فرق کیا جائے گا اور رسالت کی حیثیت میں بھی جو کچھ آپ نے ان امور کے متعلق فرمایا جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے۔ اور جن کا تعلق (آپ کے نزدیک) براہِ راست دین سے نہیں تو پھر ان امور میں بھی فرق کرنے کی ضرورت ہو گی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ان میں فرق کون کرے گا؟ اس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ

"ہم بطور خود یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضورؐ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت سے ہے یا پھر جو اصولِ شریعت حضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں محتاط اہلِ علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو ذاتی و شخصی قرار دیا جا سکتا ہے"

(ترجمان جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۴۴)

یہ تو غالباً آپ کو بھی تسلیم ہو گا کہ اس قسم کی تصریح (بجز مستثنیات کے) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں کہیں نہیں ملتی کہ جس میں حضورؐ نے فرما دیا ہو کہ یہ باتیں میں انسان کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ یا ان امور کا تعلق دین سے نہیں۔ آئندہ اس کے لیے امت کو اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ اور اہلِ علم کے باہمی اختلافات کی جو کیفیت ہے اس کی مثال میں اوپر دے چکا ہوں۔ آپ فرمائیے کہ دین کے ایسے معاملات میں جن کا اتباع امت پر واجب ہو، جن پر مسلمان کی نجات کا دارومدار ہو اور جن کے انکار سے کفر لازم آتا ہو کیا انکی حیثیت یہی ہونی چاہیے کہ ان کا تعین اہلِ علم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اور امت بے چاری مستقل طور پر اس کشمکش میں رہے کہ کس اہلِ علم کی تحقیق کو صحیح مانا جائے اور کسے غلط۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ پوزیشن کس قدر کمزور ہے[۲۱]۔ اس کا خود آپ کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کرسکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر اور ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند انسانوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان

---

[۲۱] یہ ساری بحث نافہمی پر مبنی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصولِ شریعت ہم کو دیے ہیں ان کی بنا پر یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ حضور کی حیاتِ طیبہ میں سے کیا چیز حضورؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے اور کیا چیز آپ کی نبوی حیثیت سے متعلق ہے، بشرطیکہ جو شخص اس بارے میں رائے قائم کرنے بیٹھے اس نے قرآن اور سنت اور فقہ اسلامی کے اصولؒ فروع کا مطالعہ کرنے میں اپنی زندگی کا کوئی حصہ صرف کیا ہو۔ یہ کام بہرحال عامیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ رہے اہلِ علم کے اختلافات، تو معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ علم جب کبھی کسی چیز کو سنت قرار دینے یا نہ قرار دینے میں اختلاف کریں گے، لامحالہ ان میں سے ہر ایک اپنی دلیل دے گا۔ یونہی اٹھ کر ایک دعویٰ نہیں کر دے گا۔ اسے یہ بتانا ہوگا کہ اصولِ شریعت میں سے کس قاعدے یا ضابطے کی بنا پر وہ کسی چیز کو سنت قرار دے رہا ہے یا اس کے سنت ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ اس صورت میں جو وزنی بات ہوگی وہی ٹھہر سکے گی اور جو بات بھی ٹھہرے گی اس کے متعلق سب اہلِ علم کو معلوم ہوگا کہ وہ کن دلائل کی بنا پر ٹھہری ہے۔ اس نوعیت کے اختلافات اگر باقی بھی رہ جائیں تو وہ کوئی گھبرانے کے قابل چیز نہیں ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ ایک ہوّا بنانے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں[۱۳]" (رسائل و مسائل، صفحہ ۶۷)

وحی جلی اور وحی خفی کے ذرائع ثبوت ایک ہی ہیں | ۱۰۔ اسی سے وہ اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب نہ آپ نے دیا اور نہ کسی اور گوشے سے مجھے ملا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر

۱۔ وحی منزل من اللہ کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو یا وحی جلی اور دوسری وحی غیر متلو یا وحی خفی۔

۲۔ وحی غیر متلو وحی متلو کی تکمیل کرتی تھی۔ اس کے بغیر دین نا تمام رہ جاتا تھا۔

۳۔ جو کچھ وحی غیر متلو میں خدا کی طرف سے دیا گیا تھا اسے قیامت تک کے لیے غیر متبدل رہنا تھا۔ اور اس کی اطاعت ہر مسلمان کے لیے قیامت تک واجب ہے۔

۴۔ اور (آپ کے ارشاد کے مطابق جیسے آپ نے ایک پمفلٹ میں لکھا تھا) دین کا ۱/۲ حصہ وحی کے

---

[۱۳] میری اس عبارت کا مفہوم تو اس کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے سمجھنے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی اور خلط مبحث کے لیے اسے یہاں نقل کر دیا۔ اس عبارت میں بحث اس بات پر کی گئی ہے کہ جن عقائد پر کسی شخص کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے ان کے ثبوت کے لیے محض اخبار آحاد کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے یا تو قرآن سے ثبوت ملنا چاہیے، یا متواتر روایات سے، یا کم از کم ایسی روایات سے جو متواتر المعنیٰ ہوں، یعنی بکثرت مختلف راویوں کے بیانات متفقہ طور پر یہ بتاتے ہوں کہ حضورؐ فلاں عقیدے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جزئی و فروعی احکام کے ثبوت کے لیے تو اخبار آحاد بھی کافی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ صحیح سند سے مروی ہوں، لیکن کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے والے امور کے لیے بہت زیادہ قوی شہادت کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قتل کے مقدمے میں ایک شخص کو پھانسی پر چڑھا دینے کے لیے بہت زیادہ مضبوط قرائن و شواہد درکار ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک کم درجے کے معاملے کا فیصلہ کم تر درجے کی شہادتوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

اس دوسرے حصے کے اندر ہے۔ تو کیا یہ چیز رسولؐ اللہ کے فریضۂ رسالت میں داخل نہ تھی کہ حضورؐ وحی کے اس دوسرے حصے کو بھی خود مرتب فرما کر محفوظ شکل میں امت کو دے کر جاتے جس طرح حضورؐ نے وحی کے پہلے حصے (قرآن) کو امت کو دیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تو آپ کے لیے کوئی گریز کی راہ نہیں نکل سکے گی کہ اس قسم کا کوئی مجموعہ رسولؐ اللہ نے مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا حتیٰ کہ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ اس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انسان کس نتیجہ پر پہنچے گا۔ اگر وحی کا اتنا ضخیم حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح چھوڑ گئے ہوں تو کیا اسے فریضۂ رسالت کی ادائیگی قرار دیا جا سکتا ہے؟[14]

---

[14] اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کو دیا جا چکا ہے، مگر وہ حسبِ عادت پھر یہی فرماتے ہیں کہ اس کا تو جواب ملا ہی نہیں۔ براہ کرم اسی مراسلت کے صفحات ۴۸ تا ۵۳ ملاحظہ فرمائیں کہ اس کا جواب دیا گیا تھا یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کا سارا زور جس بات پر صرف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح سنت کا بھی ایک مجموعہ کیوں نہ لکھوا دیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر حضورؐ نے قرآنِ مجید کو محض لکھوا کر چھوڑ دیا ہوتا اور ہزاروں آدمیوں نے اسے یاد کر کے بعد کی نسلوں کو زبانی نہ پہنچایا ہوتا، تو کیا محض وہ لکھی ہوئی دستاویز بعد کے لوگوں کے لیے اس بات کا قطعی ثبوت ہو سکتی تھی کہ یہ وہی قرآن ہے جو حضورؐ نے لکھوایا تھا؟ وہ تو خود محتاجِ ثبوت ہوتی، کیونکہ جب تک کچھ لوگ اس بات کی شہادت دینے والے نہ ہوتے کہ یہ کتاب ہمارے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائی تھی، اس وقت تک اس لکھی ہوئی کتاب کا معتبر ہونا مشتبہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحریر بجائے خود کسی چیز کے معتبر ہونے کا دارومدار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسی وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ زندہ انسان اس کے شاہد ہوں۔ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی معاملے کے متعلق تحریر موجود نہیں ہے مگر زندہ انسان اس کے شاہد موجود ہیں، تو کسی قانون داں سے پوچھ لیجیے کہ کیا ان زندہ انسانوں کی شہادت ساقط الاعتبار ہوگی جب تک کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دجل و فریب کا ایک اور نمونہ: آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا جو ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا اسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح پورا کیا:

"حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانے میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا۔ پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسلاً (نسل در نسل) یاد کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہ رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جاتے یا اس میں کسی وقت کوئی ردوبدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجائے۔ حفاظت کا یہ غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری

تائید میں ایک دستاویز نہ پیش کی جاتے؟ شاید آپ کو قانون کا علم رکھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس سوال کا جواب اثبات میں دے۔ آج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھوایا ہوا قرآن مجید دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے، مگر اس سے قرآن کے مستند و معتبر ہونے پر ذرہ برابر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ متواتر اور مسلسل زبانی روایت سے اس کا معتبر ہونا ثابت ہے۔ خود یہ بات کہ حضورؐ نے قرآن لکھوایا تھا۔ روایات ہی کی بنا پر تسلیم کی جا رہی ہے، ورنہ اصل دستاویز اس دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ کہیں مل بھی جاتے تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ لہٰذا تحریر پر جتنا زور یہ حضرات دیتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت پر قائم کیا ہوا ایک پورا معاشرہ چھوڑا تھا جس کی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کی تعلیم و ہدایت کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ اس معاشرے میں آپؐ کی باتیں سنے ہوئے، آپؐ کے کام دیکھے ہوئے، اور آپؐ کے زیر ہدایت تربیت پائے ہوئے ہزاروں لوگ موجود تھے۔ اس معاشرے نے بعد کی نسلوں تک وہ سارے نقوش منتقل کیے اور ان سے وہ نسلاً بعد نسلٍ ہم کو پہنچے۔ دنیا کے کسی مسلّم اصولِ شہادت کی رو سے بھی یہ شہادت رد نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ نقوش کاغذ پر ثبت نہیں کیے گئے۔ انہیں ثبت کرنے کا سلسلہ حضورؐ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پہلی صدی ہجری میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا اور دوسری صدی کے محدثین زندہ شہادتوں اور تحریری شہادتوں [illegible] نقشے کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب کے لیے نہیں ہو سکا۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے۔" (ترجمان، دسمبر سنہ ۶۰ء صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۵)

اس کے برعکس وحی کا دوسرا حصہ (جس کی حفاظت کے متعلق آپ اب فرماتے ہیں کہ "اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے۔ اور اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے"؛ اس کی کیفیت کیا ہے؟

اس کے متعلق مجھ سے نہیں خود اپنے ہی الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے رسائل و مسائل صفحہ ۲۷۰ پر لکھا ہے:

"قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں؎۔"

؎ ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمایا جائے کہ اس کے بعد کے فقرے دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جن اصحاب کے پاس رسائل و مسائل حصہ اول موجود ہو وہ نکال کر دیکھ لیں، اس فقرے کے بعد متصلاً یہ عبارت موجود ہے:

"جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات محدثین کی مسلّمہ شرائطِ تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ یقیناً ناقابلِ انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علمِ یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے اصول کا یہ متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحی کی اقسام اور دین میں ان کا مرتبہ و مقام | قرآن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے شروع میں ہی یہ کہہ دیا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کہ اس کتاب میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور وحی کے اس دوسرے حصے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ فرمائیے کہ وحی منزل من اللہ کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو میں دکھا رہا ہوں یا آپ دکھا رہے ہیں؟ پھر یہی نہیں کہ روایات کے متعلق یہ شکوک و شبہات کسی پہلے زمانے میں پیدا ہوتے ہوں اور اب مٹ چکے ہوں۔ ان کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ:

"اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ تو رہا اس طریقہ کے متعلق جس کے مطابق (بقول آپ کے) اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے اس حصے کی حفاظت فرمائی۔ باقی رہی اس کی معنوی حیثیت۔ سو اس کے متعلق جناب

احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات (یعنی جن سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے) کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔"

یہ اخلاقی جسارت واقعی قابلِ داد ہے کہ مجھے خود میری ہی عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے! اس پر مزید قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جس مسئلے کو یہاں بھیس بدل کر پیش کیا جا رہا ہے اس پر میں خود اسی مراسلت کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ پہلے روشنی ڈال چکا ہوں (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحات ۲۸ تا ۳۲-۳۹-۴۰)۔ لیکن یہ عجیب طرزِ بحث ہے کہ جس بات کا پہلے جواب دیا جا چکا ہو اسے پھر نئے لباس میں پیش کر دیا جاتا ہے اور [illegible] جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی کی تحقیق یہ ہے کہ

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابو ہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض روایات نے بعض کو صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئی ہیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں"۔ (تسنیم احادیث نمبر۔ مورخہ ۴ اراکتوبر ۱۹۵۹ء)

یعنی یہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) براہ راست اپنے ایک جلیل القدر صحابی تک اپنی "وحی" پہنچاتے ہیں۔ اور اس "وحی" کی وہیں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ یا تو بقول آپ کے اس کو سمجھنے میں اس صحابی کو غلطی لگ جاتی ہے یا وہ پوری وحی سن ہی نہیں پاتے۔ ذرا سوچیے کہ جب یہی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اڑھائی سو سال تک اسی طرح آگے بڑھتی چلی گئی ہو تو آخر الامر جو صورت بن جائے گی اس کا نقشہ کیسا ہو گا؟ کیا خدا کی حفاظت اسی کا نام ہے[16]؟

---

[16] واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں نے علوم دینی کا سرسری مطالعہ تک نہیں کیا ہے اس لیے وہ بار بار ان مسائل پر الجھتے ہیں جنہیں ایک اوسط درجے کا مطالعہ رکھنے والا آدمی بھی بلا الجھن کے بغیر صاف صاف سمجھتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے، انہیں سمجھانا تو میرے بس میں نہیں ہے، کیونکہ ان میں سمجھنے کی خواہش کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن عام ناظرین کی تفہیم کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ دو باتوں کو اگر آدمی اچھی طرح جان لے تو اس کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک یہ کہ وحی کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک، وہ جو اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی تھی تاکہ آپ انہی الفاظ میں اسے خلق تک پہنچا دیں۔ اس کا نام وحی متلو ہے اور اس نوعیت کی تمام وحیوں کو اس کتاب پاک میں جمع کر دیا گیا ہے جسے قرآن کے نام سے ساری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایات میں اختلاف کی حقیقت | اس "طریقِ حفاظت" کی کمزوری کے تو آپ خود بھی قائل ہیں جب آپ لکھتے ہیں:

دنیا جاتی ہے۔ دوسری قسم کی وحی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے نازل کی جاتی تھی۔ تاکہ اس کی روشنی میں آپ خلق کی رہنمائی فرمائیں، اسلامی نظام حیات کی تعمیر فرمائیں، اور اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیں۔ یہ وحی لوگوں کو لفظاً لفظاً پہنچانے کے لیے نہ تھی، بلکہ اس کے اثرات حضورؐ کے اقوال و افعال میں بے شمار مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتے تھے اور حضورؐ کی پوری سیرتِ پاک اس کے نور کا مظہر تھی۔ یہی چیز ہے جسے سنّت بھی کہا جاتا ہے اور وحی غیر متلو بھی، یعنی "وہ وحی جو تلاوت کے لیے نہیں ہے"۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کا علم جن ذرائع سے ہمیں ملا ہے ان کی ترتیب اس طرح ہے: سب سے پہلے قرآن۔ پھر وہ سنّتیں جو تواترِ عملی کے ساتھ حضورؐ سے منتقل ہوئی ہیں۔ یعنی جن پر شروع سے آج تک امّت میں مسلسل عمل ہوتا رہا ہے۔ پھر آپ کے وہ احکام اور آپ کی وہ تعلیمات و ہدایات جو متواتر یا مشہور روایات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ پھر اخبارِ آحاد جن کی سند بھی قابلِ اعتماد ہے، جو قرآن اور متواترات سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کی تائید و تشریح بھی کرتی ہیں۔ پھر وہ اخبارِ آحاد جو سند کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں اور کسی قابلِ اعتماد چیز سے متصادم بھی نہیں ہیں۔ اِن ذرائع سے جو کچھ بھی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی قول یا فعل جو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا قول و فعل ہے یا نہیں۔ یہ سوال دراصل صرف اُن روایات کے بارے میں پیدا ہوتا ہے (۱) جن کا مضمون کسی زیادہ معتبر چیز سے متصادم نظر آتا ہے (۲) جن کی سند قوی ہے مگر وہ باہم متصادم ہیں اور ان کا تصادم رفع کرنے میں مشکل پیش آتی ہے (۳) جن کی سند قوی ہے مگر وہ منفرد روایتیں ہیں اور معنی کے لحاظ سے ان کے اندر کچھ غرابت محسوس ہوتی ہے (۴) جن کی سند میں کسی نوعیت کی کمزوری ہے مگر معنی میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی (۵) جن کی سند میں بھی کلام کی گنجائش ہے اور معنی میں بھی۔ اب اگر کوئی بحث اِن دوسری قسم کی روایات میں پیدا ہو تو اسے یہ دعویٰ کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ پہلی قسم کے ذرائع سے جو کچھ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ بھی مشکوک ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مو فرق نہ پایا جائے[ثلہ] ــــ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد، لوگوں سے پوچھ لیجیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی

مزید برآں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ دین میں جو چیزیں اہمیت رکھتی ہیں وہ سب ہمیں پہلی قسم کے ذرائع سے ملی ہیں، اور دوسرے ذرائع سے آنے والی روایات اکثر و بیشتر محض جزوی و فروعی معاملات سے متعلق ہیں جن میں ایک مسلک یا دوسرا مسلک اختیار کر لینے سے درحقیقت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ ایک شخص اگر تحقیق کر کے ان میں سے کسی روایت کو سنت کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اور دوسرا تحقیق کر کے اسے سنت نہ مانے تو دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو مانے جائیں گے۔ البتہ اُن لوگوں کو حضورؐ کا پیرو نہیں مانا جا سکتا جو کہتے ہیں کہ حضورؐ کا قول و فعل اگر ثابت بھی ہو کہ حضورؐ ہی کا قول و فعل ہے تب بھی وہ ہمارے لیے آئین و قانون نہیں ہے۔

[ثلہ] اس کے بعد کا فقرہ ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر خود دیکھ سکتا ہے کہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے:

"اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فروعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائیگا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔"[۸]

(تفہیمات جلد اوّل صفحہ ۳۳۰)

---

[۸] اس کے بعد کی پوری بحث چونکہ ڈاکٹر صاحب کے شبہات کا جواب بھی اور ان سے الجھن رفع ہو سکتی تھی اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں تو الجھن ہی کی تلاش ہے۔ ایک مضمون میں سے جتنے فقرے الجھنے اور الجھانے کے لیے مل سکتے ہیں انہیں لے لیتے ہیں، اور جہاں سے بات سلجھنے کا خطرہ ہوتا ہے صاف کترا کر نکل جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ دھوکا ایک مصنف کی کتاب سے خود مصنف کو دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں ناظرین سے گزارش کروں گا کہ اگر تفہیمات حصہ اوّل انہیں بہم پہنچ جائے تو اس میں سے "حدیث کے متعلق چند سوالات" کے زیرِ عنوان وہ پورا مضمون نکال کر ملاحظہ فرمائیں جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے فوراً بعد جو فقرے میں نے لکھے تھے وہ یہاں بھی نقل کر دیے جائیں تاکہ جنہیں اصل کتاب نہ مل سکے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کرتب کی داد دے سکیں۔ وہ فقرے یہ ہیں:

"اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہہ دے کہ میں نے سر سے کوئی تقریر ہی نہیں کی، یا جو تقریر کی تھی وہ از سرتاپا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر تقریر کے متعلق تمام اخبارِ آحاد کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ متفق و منقول ... ہوں گے وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ختمِ نبوت یا ختمِ نبی؟ یہ ہے وہ حفاظت جس کی اہمیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں۔

"ختمِ نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسول کی رہنمائی اور اس کے نقوشِ قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری خود لے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے[19]" (ترجمان۔ دسمبر ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۱۸۱)

۱۱۔ ذرا سوچیے کہ وحی کے اس حصے کی حفاظت کی جو شکل آپ بیان فرماتے ہیں اس کے بعد ایک نئے رسول کے آنے کی ضرورت آپ خود ہی ثابت نہیں کر رہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جو وحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی تھی وہ اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہی (حالانکہ وہ حضرت عیسیٰ کے صحابہ نے مرتب کی تھی)۔ کیا اس دلیل کے مطابق آپ رسول اللہ کے بعد ایک اور رسول کے آنے

اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ تیار کر لیا جائیگا۔ اور جن حصوں کے بیان میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبتاً کم معتبر ہونگے مگر ان کو موضوع اور غلط کہہ دینا صحیح نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور بات ان میں ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے، مثلاً تقریر کے معتبر حصوں سے مختلف ہونا، یا مقرر کے خیالات اور اندازِ بیان اور افتادِ مزاج کے متعلق جو صحیح معلومات لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں ان کے خلاف ہونا۔"

۱۹؎ جی ہاں، میرے نزدیک تو ختمِ نبوت کا اعلان اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ البتہ آپ لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے ساتھ نبی کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس کا نام و نشان ایسا مٹے کہ کسی کو اس کی سیرت اور اس کے کام کا پتہ نہ چل سکے۔ چونکہ آپ لوگوں کی بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اس لیے اب آپ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے کے لیے لگا رہے ہیں کہ حضور کی سیرت و سنت کے متعلق جو عظیم الشان ذخیرۂ معلومات آج [illegible] مشتبہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ضرورت ثابت نہیں کر رہے ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس کی حفاظت کی دلیل یہ ہے کہ وضو۔ پنجوقتہ نماز۔ اذان۔ عیدین کی نمازیں۔ نکاح وطلاق و وراثت کے قاعدے وغیرہ مسلم معاشرے میں ٹھیک ا اسی طرح رائج ہیں جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھی ہوں۔ اس ضمن میں گزارش ہے کہ

اُمّت کا اختلاف زیادہ تر جزئیات میں ہے | ۱۔ آپ کا جو اقتباس میں نے اوپر دیا ہے اس میں آپ نے خود فرمایا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس طرح متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مُو فرق نہ پایا جائے۔ کیا اس کے بعد آپ یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ جن اعمال اور ضوابط کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ امت میں اسی طرح چلے آرہے ہیں جس طرح حضورؐ نے فرمایا یا کیا تھا؟ اور ان میں یک سرِ مُو فرق نہیں آیا؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ نماز اور اذان۔ نکاح اور طلاق اور وراثت وغیرہ میں تمام اُمّت ایک ہی طریقے پر عمل کر رہی ہے؟ کیا خدا کی حفاظت اور ذمہ داری اسی کو کہتے ہیں؟ کیا اُمّت کے مختلف فرقے اپنے اپنے ہر دینی عمل کو رسول اللہ صلعم کی سنت نہیں قرار دے رہے ہیں؟ کیا آپ نے یہ نہیں لکھا کہ "اس میں شک کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہو وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں[20]؟"

---

[20]ـ اس ساری بحث کا جواب میرے پچھلے حواشی میں آچکا ہے (ملاحظہ ہو حواشی نمبر ۱۴، ۱۶-۱۷، ۱۸)۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کافی ہے کہ نماز اور اذان اور نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ امور کے متعلق جتنی چیزوں پر امت میں اتفاق ہے ان کو ایک طرف جمع کر لیجیے، اور دوسری طرف وہ چیزیں نوٹ کر لیجیے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ اتفاق بہت زیادہ ہے اور اختلاف بہت کم۔ بنیادی امور قریب قریب سب متفق علیہ ہیں اور اختلاف زیادہ تر جزئیات میں ہے۔ لیکن چونکہ بحث اتفاقی امور میں نہیں بلکہ ہمیشہ اختلافی امور میں ہوتی ہے۔ اس لیے بحثوں نے اختلافات کو نمایاں کر دیا ہے جس کی وجہ سے کم علم لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ امت میں کوئی چیز بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک سطحی مغالطہ ۴۔ شاید آپ یہ کہہ دیں کہ یہ اختلافات جزئیات کے معمولی اختلافات ہیں ان سے دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بس پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ جن جزئیات کو بقول آپ کے خدا کی وحی نے متعین کیا ہو کیا ان میں ذرا سا اختلاف بھی معصیت کا موجب نہیں ہو جاتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مندرج وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ وضو میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھویا کرو۔ اگر کوئی شخص یا فرقہ اپنے ہاتھ صرف پہنچوں تک دھوتا ہے تو کیا آپ کے نزدیک یہ بھی اسی طرح حکم خداوندی کی تعمیل ہو گی جس طرح اس شخص یا فرقہ کا عمل جو کہنیوں تک ہاتھ دھوئے۔ ارشاد باری تعالیٰ کی تعمیل کہلائے گا؟[ا]

متفق علیہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لے لیجیے۔ تمام دنیا کے مسلمان ان امور پر پوری طرح متفق ہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اس کے اوقات یہ ہیں۔ اس کے لیے جسم اور لباس پاک ہونا چاہیے۔ اس کے لیے باوضو ہونا چاہیے۔ اس کو قبلہ رخ پڑھنا چاہیے۔ اس میں قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعود اس ترتیب سے ہونا چاہیے۔ ہر وقت کی اتنی اتنی رکعتیں فرض ہیں۔ نماز کی ابتدا تکبیر تحریمہ سے ہونی چاہیے۔ نماز میں بحالت قیام فلاں چیزیں، بحالت رکوع فلاں، بحالت سجود فلاں اور بحالت قعود فلاں چیزیں پڑھنی چاہییں۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی نماز کا پورا بنیادی ڈھانچہ متفق علیہ ہے۔ اختلاف صرف اس طرح کے معاملات میں ہے کہ ہاتھ باندھا جائے یا چھوڑا جائے، باندھا جائے تو سینے پر یا ناف پر۔ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں۔ سورۂ فاتحہ کے بعد آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ۔ سوال یہ ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کرنا کیسے صحیح ہو گا کہ نماز کے معاملہ میں امت کسی متفق علیہ طریقے پر ہے ہی نہیں۔ اذان میں اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں کہ شیعہ حی علی خیر العمل کہتے ہیں اور سُنّی نہیں کہتے۔ باقی اذان کے تمام کلمات اور متعلقہ مسائل بالکل متفق علیہ ہیں۔ کیا اس ذرا سے اختلاف کو اس بات کی دلیل بنایا جا سکتا ہے کہ اذان بجائے خود مختلف فیہ ہے؟

[ا] یہ محض ایک سطحی مغالطہ ہے۔ قمیص کا کہیں کہیں سے خلاف ہونا درزی کا نام اختلاف نہیں ہے بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنت دائرۂ اختلاف کو محدود کرنے والی ہے | سوچیے کہ اگر وحی کے ایک حصے میں جزئیات کا اتنا سا خفیف اختلاف بھی شریعت کی خلاف ورزی کہلا سکتا ہے تو وحی کے دوسرے حصے میں اتنے بڑے اختلافات (مثلاً ایک فرقہ جس جنسی تعلق کو عین مطابق شریعت رسول اللہ قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے زنا سے تعبیر کرتا ہے)۔ احکام خداوندی پر کچھ اثر انداز نہیں ہونگے۔ یہ جزئیات ہی تو تھیں جن کے تعین کے لیے اس دوسری وحی کی ضرورت پڑی۔ اگر ان کا اختلاف کچھ ایسا وزن نہیں رکھتا تو پھر اس کے لیے اس وحی کی ضرورت کیا تھی؟[21]

اختلاف اس چیز کا نام ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان یہ بات مختلف فیہ ہو کہ حکم شرعی کیا ہے۔ اس کی صحیح مثال خود قرآن ہی سے حاضر ہے۔ قرآن کی آیت تیمم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (المائدہ - ۶) "اس مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو" اب اگر کوئی شخص "ہاتھ" سے مراد پہنچے تک لیتا ہے اور اسی پر مسح کرتا ہے، دوسرا کہنی تک لیتا ہے اور وہاں تک ہاتھ پھیرتا ہے، اور تیسرا خیال کرتا ہے کہ لفظ ہاتھ کا اطلاق تو شانے تک پورے ہاتھ پر ہوتا ہے اس لیے وہ مسح میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے تو فرمائیے کہ اس اختلاف کی گنجائش قرآن کے الفاظ میں ہے یا نہیں؟ پھر کیا یہ اختلاف معصیت کا موجب ہو جاتا ہے؟

۲۱ھ ڈاکٹر صاحب کچھ عقل سے کام لیتے تو وہ خود دیکھ سکتے تھے کہ وحی کے اس دوسرے حصے نے اختلافات کے دائرے کو بہت محدود کر دیا ہے۔ ورنہ اگر یہ دوسرا حصہ نہ ہوتا تو پہلے حصے (یعنی قرآن مجید) سے احکام اخذ کرنے میں اتنے اختلافات ہوتے کہ دو مسلمان بھی مل کر کوئی اجتماعی عمل نہ کر سکتے۔ مثلاً قرآن بار بار صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت اس کی شکل اور طریقہ متعین نہ کر دیتی تو لوگ ہرگز یہ طے نہ کر سکتے کہ اس حکم کی تعمیل کیسے کریں۔ قرآن زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت نے اس کی تشریح نہ کر دی ہوتی تو کبھی اس امر میں اتفاق نہ ہو سکتا کہ یہ فریضہ کس طرح بجا لایا جائے۔ ایسا ہی معاملہ قرآن کی اکثر و بیشتر ہدایات و احکام کا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک با اختیار معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان پر عمل کی شکل بتا کر اور عملاً کر کے اختلافات کا سدباب کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منکرینِ سنت اور منکرینِ ختمِ نبوت میں وجوہِ مماثلت | ۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اگر سنت کے متن میں اس قدر اختلافات ہیں تو قرآن کی تعبیر میں بھی تو بے شمار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اگر قرآن کی تعبیر میں اختلاف اسے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں تو سنت کے متن کا اختلاف اس امر میں کیسے مانع ہو سکتا ہے" آپ کی یہ دلیل بعینہٖ اس طرح کی ہے جس طرح جب مرزائی حضرات سے کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کے کردار میں فلاں نقص پایا جاتا ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ (معاذاللہ معاذاللہ) رسول اللہؐ کی فلاں بات بھی ایسی نہیں تھی؟[۲۳]

اگر یہ چیز نہ ہوتی اور امت صرف قرآن کو لیکر لغت کی مدد سے کوئی نظامِ زندگی بنانا چاہتی تو بنیادی امور میں بھی اس حد تک اتفاق رائے حاصل نہ ہو سکتا کہ کوئی مشترک تمدن بن جاتا۔ یہ سنت ہی کا طفیل ہے کہ تمام امکانی اختلافات سمٹ کر دنیائے اسلام میں اس وقت صرف آٹھ فرقے پائے جاتے ہیں اور ان میں بھی بڑے فرقے صرف پانچ ہیں جن کے اندر کروڑوں مسلمان ایک ایک فقہ پر مجتمع ہو گئے ہیں۔ اسی اجتماع کی بدولت ان کا ایک نظامِ زندگی بن اور چل رہا ہے۔ لیکن منکرینِ حدیث سنت کے خلاف جو کھیل کھیل رہے ہیں اس میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ قرآن کی تفسیر و تعبیر پر سب متفق ہو جائیں گے بلکہ یہ ہوگا کہ جن امور میں آج اتفاق ہے وہ سب بھی اختلافی بن کر رہ جائیں گے۔

[۲۳] ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے کہ جھوٹے نبی اور سچے نبی میں درحقیقت کوئی مشابہت نہیں ہے۔ سچے نبی اور اس کی لائی ہوئی کتاب کے درمیان جو ربط و تعلق ہوتا ہے وہ نہ جھوٹے نبی اور سچے نبی کے درمیان ہو سکتا ہے اور نہ اس کے اور کتاب اللہ کے درمیان۔ مزید برآں ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ درا صل خود ان پر اور ان کے گروہ پر صادق آتی ہے جس طرح مرزائی حضرات ایک جعلی نبی کی نبوت ثابت کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان میں لاتے ہیں، اسی طرح منکرینِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور کتاب اللہ کا تعلق کاٹ پھینکنے کے لیے کتاب اللہ کو استعمال کرتے ہیں جس طرح مرزائیوں نے تمام امت کے متفقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنت کو اساسِ آئین بنانے پر اعتراض اور اس کا جواب | ابھی حضرت! متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کریم کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے دین کی سند اور حجت نہیں ہو سکتا[۲۲]۔ اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں ان کے متن میں ہی

عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف ایک نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا، اسی طرح منکرینِ حدیث نے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر کے ایک دوسرا خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا حالانکہ خلفائے راشدین کے عہد سے آج تک تمام دنیا کے مسلمان ہر زمانے میں اس بات پر متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد سنت دوسرا ماخذِ قانون ہے حتیٰ کہ غیر مسلم ماہرینِ قانون بھی بالاتفاق اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائی ختم نبوت کی غلط تاویل کر کے ایک نیا نبی سامنے لے آتے ہیں، اسی طرح منکرینِ حدیث اتباعِ سنت کی غلط تعبیر کر کے یہ راستہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ہدایات و تعلیمات کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور کسی "مرکزِ ملت" کو ہر زمانے میں امت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ مرزائی اپنے نبی کی نبوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے ذاتِ رسول میں نقص نکالتے ہیں اور منکرینِ حدیث اپنے مرکزِ ملت کے لیے راستہ بنانے کی خاطر سنتِ رسول کی عیب چینی کرتے ہیں۔ رہا وہ اعتراض جو میرے استدلال پر ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ تو وہ درحقیقت بالکل بے بنیاد ہے۔ میرا استدلال یہ نہیں ہے کہ آپ سنت میں جو عیب نکال رہے ہیں وہ قرآن میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اس کے برعکس میرا استدلال یہ ہے کہ تعبیر و تحقیق کے اختلافات کی گنجائش ہونا کسی آئین و قانون کے لیے عیب و نقص نہیں ہے۔ لہٰذا اس گنجائش کی بنا پر نہ قرآن کو اساسِ قانون بنانے سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ سنت کو۔

۲۲؎ یہی تو سوال ہے کہ اگر کتاب کے الفاظ متفق علیہ ہوں لیکن تعبیرات میں اختلاف ہو تو وہ آئین کی بنیاد کیسے بنے گی؟ ڈاکٹر صاحب خود فرما رہے ہیں کہ "تعبیر ایک انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے حجت اور سند نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں تو لامحالہ صرف الفاظ حجت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلاف ہے۔ ایک فرقہ ایک حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مانتا ہے تو دوسرا اس کے قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے سے ہی یکسر انکار کر دیتا ہے۔ آپ نے اپنے آخری خط میں لکھا ہے کہ سنتوں کے متعلق اس قسم کے اختلاف سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا تو کیا اس سے اس کے ایمان پر کوئی آنچ آئے گی یا نہیں؟ اگر آنچ آئے گی تو پھر حدیث اور قرآن کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟

کچھ سمجھا آپ نے کہ نص کے اختلاف اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے؟

لیکن آپ اسے کیا سمجھیں گے جو کہہ رہے ہیں کہ اگر احکام اخذ کرتے ہیں لوگوں کا اختلاف

سند رہ جاتے ہیں اور معنی میں اختلاف ہو جانے کے بعد ان کا حجت و سند ہونا لاحاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ عملاً جو چیز نافذ ہوتی ہے وہ کتاب کے الفاظ نہیں بلکہ اس کے وہ معنی ہوتے ہیں جنہیں کسی شخص نے الفاظ سے سمجھا ہو۔ اسی لیے میں نے اپنے دوسرے خط میں اُن سے عرض کیا تھا کہ پہلے آپ اپنے اس نقطۂ نظر کو بدلیں کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے"۔ اس کے بعد جس طرح یہ بات طے ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید بجائے خود اساسِ آئین ہو اور اس کی مختلف تعبیرات میں سے وہ تعبیر نافذ ہو جو کسی با اختیار ادارے کے نزدیک اقرب الی الصواب قرار پائے، اسی طرح یہ بات بھی طے ہو سکتی ہے کہ سنت کو بجائے خود اساسِ آئین مانا جائے اور معاملات میں عملاً وہ سنت نافذ ہو جو کسی با اختیار ادارے کی تحقیق میں سنتِ ثابتہ قرار پائے۔ جس طرح قرآن کے الفاظ کو اساسِ آئین ماننے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تعبیر کے اختلافات کا سارا چکر صرف الفاظِ قرآن کے حدود میں گھوم سکے گا، ان کے دائرے سے باہر نہ جا سکے گا، اسی طرح "سنت" کو اساسِ آئین ماننے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں اپنے عمل کے لیے انہی ہدایات و تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہیں اور ہم کوئی آزادانہ قانون سازی اس وقت تک نہ کر سکیں گے جب تک تحقیق سے ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ فلاں مسئلے میں کوئی سنت ثابت نہیں ہے۔ یہ سیدھی سی بات سمجھنے میں آخر کیا دقت ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی اس نرالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں ناحق اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات ہی لینی تھیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدے کے متعلق یہ ایمان ہو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کی جائے؟[25]

قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے میں اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب دین ایک اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا۔ اس وقت تک اس باب میں امت میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے میں امت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے؟ پھر اس قسم کا نظام قائم ہو گا تو پھر تعبیرات کے یہ اختلافات باقی نہیں رہیں گے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو امت میں وحدتِ عملی کا امکان ہی باقی نہ رہتا۔ تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسول آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا۔[26]

---

[25] اس ساری تقریر کا جواب اوپر حواشی نمبر ۱۶-۲۱-۲۲ اور ۲۴ میں آگیا ہے۔

[26] کسی معاملے کو سمجھے بغیر اس پر تقریر جھاڑنے کی یہ دلچسپ مثال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی لوگ قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کرتے تھے اور ان کے درمیان فہم و تعبیر کا اختلاف ہوتا تھا۔ مگر اس وقت خلیفۂ راشد اور مجلس شوریٰ کا با اختیار ادارہ ایسا موجود تھا جسے اقتدار بھی حاصل تھا اور امت کو اس کے علم و تقویٰ پر اعتماد بھی تھا۔ اس ادارے میں بحث و تمحیص کے بعد قرآن کے کسی حکم کی جس تعبیر کے حق میں جمہوری طریقے پر فیصلہ ہو جاتا تھا وہی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو جاتی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے بارے میں بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا محض تحریری ریکارڈ ہی ذریعہ ہدایت ہو سکتا ہے؟ ۴۔ میں نے کہا تھا کہ اگر اعمال و اقوالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کا غیر متبدل جزو تھے جس کا اتباع ہر مسلمان کے لیے قیامت تک کے لیے واجب تھا۔ تو ان احکام کو قرآن کی طرح مرتب کتاب کی شکل میں امت کو ملنا چاہیے تھا۔ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ جس بازاریت پر اتر آتے ہیں اس کا تو میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔[۲۷] البتہ آپ نے جن مثالوں کو اپنی دلیل بنایا ہے ان کے متعلق ضرور کچھ عرض کروں گا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں کوئی ایسا لیڈر ہو جو قوم کی زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہر قول اور عمل کتابی شکل میں مدون ہو سکے؟

بندہ نواز! یاد رکھیے کہ ایک عام لیڈر میں اور ایک نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ عام لیڈر کے اقوال اور اعمال اس کے ہم عصروں یا آنے والوں کے لیے دینی حجت نہیں ہوتے۔ نہ کوئی ان پر ایمان لانے کے لیے مکلف ہوتا ہے۔ نہ وہ حق اور باطل کا ابدی معیار قرار پاتے ہیں۔ نہ ان پر کسی کی نجات کا دارومدار ہوتا ہے۔ نہ ان کی خلاف ورزی سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ محض اس کی ذاتی کوششوں کا مظہر ہوتا ہے۔

اس وقت باقاعدہ تحقیق کی جاتی تھی اور جب یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی مسئلے میں حضورؐ نے یہ فیصلہ دیا تھا یا اس طرح عمل کیا تھا، تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ آج بھی اگر ایسا کوئی ادارہ موجود ہو تو وہ جس طرح قرآن کی تعبیرات میں سے وہ تعبیر اختیار کرنے کی کوشش کریگا جو زیادہ سے زیادہ اقرب الی الصواب ہو اسی طرح وہ احادیث کے مجموعوں میں سے ان سنتوں کو تلاش کرے گا جن کا زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش ثبوت مل سکے۔

۲۷ یہ بحث اس کتاب کے صفحات ۳۲-۳۵ پر موجود ہے۔ ناظرین خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ بازاریت اُس میں ہے یا ڈاکٹر صاحب کے اس طرزِ کلام میں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر وہ ریکارڈ نہ بھی مرتب ہو یا اگر مرتب ہو اور اس میں اسقام یا اختلافات پائے جائیں تو اس سے نہ کسی کا دین خراب ہوتا ہے نہ عاقبت بگڑتی ہے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ وہ منزل من اللہ ہیں۔ دین کا 9/10 حصہ ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے قیامت تک واجب الاتباع ہیں۔ ان کی خلاف ورزی خدا کی معصیت ہے جس کا نتیجہ جہنم کا عذاب ہے۔ فرمایئے کہ ایسی ہستی کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ اور ہمارے زمانے کے کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

آپ نے لکھا ہے کہ جب موجودہ زمانے کے ایسے وسیع اسباب و ذرائع کے باوجود کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا ممکن نہیں تو حضورؐ کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا کس طرح ممکن تھا؟ آپ نے سوچا بھی ہے کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا اُن امور کو تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے نجات کا مدار قرار دے رہا ہے جن کا انسانوں تک مرتب اور محفوظ شکل میں پہنچانا ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کے کہنے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ جن احکام کو عملاً کر کے دکھایا جاتا ہے وہ کتابی شکل میں مرتب نہیں ہو سکتے۔ آپ کا یہ خیال سرے سے غلط ہے۔ آج بازاروں میں نماز کی کتابیں

؎ یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے یہ خود ہی فرض کر لیا ہے کہ کسی تعلیم و ہدایت کو لوگوں تک محفوظ طریقے سے پہنچانے کا واحد ذریعہ صرف تحریر ہے، پھر خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ایک ضخیم کتاب نہیں لکھوائی گئی جس میں حضورؐ کی ساری تقریریں، گفتگوئیں، فیصلے، ہدایات، تعلیمات اور آپ کے کام درج ہوتے اس لیے اس سیرتِ پاک اور اسوۂ حسنہ کا لوگوں تک محفوظ طریقے سے پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔ حالانکہ یہ مفروضہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں بجائے خود غلط ہے اور اس پر جس نتیجے کی بنا رکھی گئی ہے وہ بھی غلط ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام ملتی ہیں۔ جن میں نماز کی تمام جزئیات الفاظ میں لکھی ہوئی درج ہوتی ہیں اور ان سے ہر شخص نماز کی شکل کو متعین کر سکتا ہے[29]۔ دنیا کی یہ بڑی بڑی عمارتیں عظیم الشان پل، پیچیدہ سے پیچیدہ مشینیں آخر ان کتابوں کی مدد سے ہر مقام پر تعمیر اور مرتب ہوتی ہیں جن میں ان کی تفاصیل درج ہوتی ہیں۔ بالآخر دین کے اعمال میں وہ کونسی مشکل تھی جس کی بنا پر وہ الفاظ میں بیان نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اور اگر آپ کی ضد کے پیش نظر کوئی مان بھی لے کہ اعمال کو الفاظ میں ریکارڈ کرنا ممکن نہیں تھا تو آپ قولی حدیثوں کے متعلق کیا فرمائیں گے؟ کیا یہ بھی رسول اللہ کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ان ارشادات کو اپنے الفاظ میں محفوظ کر کے امت کو دے جاتے جس رسول نے اپنی وحی کی ایک قسم کی کتابت کے لیے ایک چھوڑ چھبیس چھبیس کاتب مقرر فرماتے جس نے اس وحی کے الفاظ کو سینکڑوں افراد کو حفظ کرایا۔ کیا اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اپنی وحی کے "دوسرے حصے" کو بھی اسی طرح محفوظ کر دیتا۔

ایک اور دلچسپ مغالطہ | ۵۔ آپ فرماتے ہیں کہ دیکھیے برطانیہ کا آئین تحریری شکل میں موجود نہیں، پھر بھی ان کا کام کیسے چل رہا ہے۔ بندہ پرور! آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ برطانیہ کے آئین میں نت نئے دن کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کی پارلیمانی اکثریت جو تبدیلی چاہے کر سکتی ہے۔ کیا دین کی بھی آپ کے نزدیک یہی حیثیت ہے؟ اگر دین کے آئین کے تحریری نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا تو قرآن کریم کو کیوں تحریر میں لایا گیا۔ اور اس تحریر کی حفاظت کا ذمہ خدا نے کیوں لیا[30]۔ کیا اللہ میاں کے علم میں (معاذ اللہ) برطانوی

---

[29] ڈاکٹر صاحب کا مطلب غالباً یہ ہے کہ لوگوں کو نماز سکھانے کی واحد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ طریقۂ نماز کی ایک مصور کتاب لکھوا کر پھیلائی جاتی۔ رہی یہ صورت کہ حضورؐ خود روزانہ پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھاتے تھے اور سینکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس طریقے سے نماز سیکھی اور دوسرے لوگوں کو سکھائی تو یہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی قابل اعتماد صورت نہیں۔

[30] یہ ایک اور دلچسپ مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا نہ کہ اُس تحریر کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئین کا تجربہ نہیں تھا؟[۳۱]

شخصی قانون اور ملکی قانون میں تفریق کیوں؟ | ۱۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ سنن ثابتہ کے اختلاف کو برقرار رکھتے ہوئے پاکستان میں صحیح اسلامی آئین کے مطابق، قانون سازی کا مسلک یہ ہے کہ

"شخصی قانون (پرسنل لا) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکام قرآنی کی وہی تعبیر اور سنن ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے۔ اور ملکی قانون (پبلک لا) کی تعبیر قرآن اور ان سنن ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے۔"

کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ

۱۔ شخصی قانون اور ملکی قانون کا یہ فرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضورؐ کے خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی تھا؟

۲۔ کیا قرآن کریم سے اس تفریق کی کوئی سند مل سکتی ہے؟

حفاظت کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں کاتبانِ وحی سے لکھوائی تھی۔ قرآن تو یقیناً خدا کے وعدے کے مطابق محفوظ ہے۔ مگر کیا وہ اصل تحریر بھی محفوظ ہے جو حضورؐ نے لکھوائی تھی؟ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے علم میں کہیں ہے تو ضرور اس کی نشان دہی فرمائیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور تمام منکرینِ حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دارومدار رکھتے ہیں لیکن یہ بات کہ حضورؐ اپنے زمانہ میں کاتبانِ وحی سے ہر نازل شدہ وحی کو لکھوا لیتے تھے، اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں لکھا گیا۔ اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے شائع کیں، یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابلِ اعتماد ہی نہیں ہیں تو پھر کس دلیل سے آپ دنیا کو یہ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضورؐ ہی کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

اس کے بیان تک کی ساری تقریر [illegible] گزر چکا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ کیا شخصی قانون اور ملکی قانون کی یہ تفریق اس زمانے کی پیداوار نہیں جس میں مذہب اور سیاست کی ثنویت پیدا ہوئی؟

۴۔ کیا کوئی آئین یا قانون جو اس تفریق یا ثنویت کو برقرار رکھے کسی صورت میں بھی اسلامی کہلا سکتا ہے؟

۵۔ کیا اسے خدا کی اطاعت اور رسول اللہ صلعم کی سنت کا اتباع قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: یہ سارے سوالات صرف اس بنا پر پیدا ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نہ تو شخصی قانون اور ملکی قانون کے معنی اور حدود کو سمجھے ہیں، اور نہ اُس عملی مسئلے پر انہوں نے کچھ غور کیا ہے جو پاکستان میں ہمیں درپیش ہے۔ شخصی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو لوگوں کی خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نکاح و طلاق اور وراثت۔ اور ملکی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو ملک کے عام نظم و ضبط کے لیے درکار ہیں، مثلاً فوجداری اور دیوانی قانون۔ پہلی قسم کے قوانین کے بارے میں یہ ممکن ہے کہ ایک مملکت میں اگر مختلف گروہ موجود ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے حق میں اُس قانون کو نافذ کیا جائے جس کا وہ خود قائل ہو، تاکہ اسے اپنی خانگی زندگی کے محفوظ ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ لیکن دوسری قسم کے قوانین میں الگ الگ گروہوں کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لامحالہ سب کے لیے یکساں ہی ہونے چاہییں۔ قرآن مجید کے عہد میں مسلمان تو ایک ہی گروہ تھے، لیکن مملکتِ اسلامیہ میں یہودی عیسائی اور مجوسی بھی شامل تھے جن کے شخصی قوانین مسلمانوں سے مختلف تھے۔ قرآن نے اُن کے لیے جزیہ دے کر مملکتِ اسلامیہ میں رہنے کی جو گنجائش نکالی تھی اس کے معنی یہی تھے کہ ان کے مذہب اور ان کے شخصی قانون میں مداخلت نہ کی جائے گی، البتہ اسلام کا ملکی قانون ان پر بھی اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح مسلمانوں پر ہوگا۔ چنانچہ اسی قاعدے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت نے عمل کیا۔

اب پاکستان میں ہم جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں وہ نزولِ قرآن کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ اس سے ۱۴ سو سال بعد کا زمانہ ہے [illegible] مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے بن چکے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلطِ مبحث اب آئیے اس سوال کی طرف کہ ملکی قانون اس تعبیرِ قرآن اور سنتِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے۔ اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اس اکثریت کے متعلق آپ کیا فرما چکے ہیں۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ تو اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۸ عدد ۱ صفحہ ۲۷)

آپ فرمائیے کہ اس اکثریت کی تعبیر اب اسلامی قانون کہلائے گی؟ ان افراد کی

اور ان کو بنے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ ان کے درمیان قرآن کی تعبیر میں بھی اختلافات ہیں اور سنتوں کی تحقیق میں بھی۔ اگر ہم ان مختلف فرقوں کو یہ اطمینان دلا دیں کہ ان کے مذہبی اور خانگی معاملات انہی کی مسلّمہ فقہ پر قائم رہیں گے اور صرف ملکی معاملات میں ان کو اکثریت کا فیصلہ ماننا ہوگا تو وہ بے کھٹکے ایک مشترک ملکی نظام اسلامی اصولوں پر بنانے کے لیے تیار ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی "مرکزِ ملت" صاحب قرآن کا نام لے کر ان کے مذہبی عقائد و عبادات اور ان کے خانگی معاملات میں زبردستی مداخلت کرنے پر اتر آئیں اور ان سارے فرقوں کو توڑ ڈالنا چاہیں، تو یہ ایک سخت خونریزی کے بغیر ممکن نہ ہوگا بلاشبہ یہ ایک مثالی حالت ہوگی کہ مسلمان پھر ایک ہی جماعت کی حیثیت اختیار کر لیں جس میں امتِ مسلمہ کے لیے تمام قوانین کھلے اور آزادانہ بحث و مباحثے سے طے ہو سکیں لیکن یہ مثالی حالت نہ پہلے ڈنڈے کے زور سے پیدا ہوئی تھی نہ آج اسے ڈنڈے کے زور سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکثریت جن کے متعلق آپ دوسرے مقام پر کہہ چکے ہیں کہ :

"مسلم سوسائٹی ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۲۷)

معلوم نہیں آپ نے اس چڑیا گھر کے الوؤں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

ممکن ہے آپ یہ فرمادیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان نہیں جن کا مذہب سے تعلق ہے۔ لیکن ان کے متعلق آپ کی رائے یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ کچھ دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہب کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام پر ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے ہیں اور نزاعیں برپا کراتے ہیں کہ بسا اوقات سر پھٹوّل اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۰، عدد ۶، صفحہ ۴۵۷)

مفید جھوٹ: اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثریت سے آپ کی مراد "صالحین" کی جماعت ہے اور وہ بھی اس وقت تک جب وہ آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ کیونکہ جو آپ سے معمولی اختلاف کرے وہ صالح ہی نہیں رہتا۔[۳۴]

---

[۳۴] ایک معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ بحث کے موڈ میں نہ ہو۔ کہ جہاں تعبیرِ قانون اور قانون سازی کا معاملہ زیرِ بحث ہو وہاں اکثریت سے مراد اہلِ علم کی اکثریت ہوتی ہے نہ کہ عوام کی اکثریت۔ میری کتاب "سیاسی کشمکش" کی جن عبارتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے ان میں قانون سازی کا مسئلہ زیرِ بحث نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے عام قومی امراض پر گفتگو تھی۔ اُن عبارات کو لا کر ڈاکٹر صاحب اس بحث میں استعمال فرما رہے ہیں جو خالص قانونی مسائل کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ غلط بحث نہیں تو اور کیا ہے۔

[۳۵] کیا کوئی شخص میری کسی تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں میں نے یہ کہا ہو کہ قانونی مسائل میں رائے دینے والے اہلِ علم صرف وہی "صالح" [illegible] مانے جائیں گے جو میری ہاں میں ہاں ملائیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد براری کے لیے عبارتوں کی قطع و برید

۱۳۔ آپ نے سنت کے معلوم کرنے کے ذریعہ کے سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا ثبوت وہ معاشرہ ہے جو اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے اور اس کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات نظریہ حیات اور طریق حیات کے لحاظ سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جس معاشرے کے وجود کو آپ سنت رسول اللہ صلعم کی دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ ہمیں پہلے بتا چکے ہیں کہ "حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی سے اس پر جاہلیت نے حملہ شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور ختم ہو گیا اور حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی"۔ اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ

> "جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ مسلمان بن کر آئی تھی۔ آگے آگے توحید کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ چنانچہ سیاست، تعلیم، طریقت پر آہستہ آہستہ جاہلیت چھا گئی۔ اور اس کے اثرات روز بروز پھیلتے چلے گئے۔ اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیے چلے آئے اور انہوں نے پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کر لیے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک نئی شریعت ایجاد کر لی۔" (تجدید و احیائے دین صفحہ ۲۳ - ۲۵)

۵؎ یہ تمام عبارات میری کتاب [illegible] سے نقل کی گئی ہیں۔ جن حضرات کو ۔۔۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا یہی ہے وہ معاشرہ جس کے وجود کو آپ سنت رسول اللہ کے لیے بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ اس معاشرے کو آپ "چڑیا گھر" سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ اور اسی چڑیا گھر کو آپ اب سنت رسول اللہ کی تثبیت (؟ غالباً ثبوت مراد ہے) کے طور پر بطور دلیل پیش کر رہے ہیں قلم ہاتھ میں لیتے وقت انسان کو کچھ سوچنا بھی چاہیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس سے پیشتر کیا لکھ چکا ہوں۔ دین کو جرنلزم کی سطح سے کچھ تو اونچا رکھنا چاہیئے۔

حیثیت رسولؐ کے بارے میں فیصلہ کن بات سے گریز

۱۴- آپ نے ترجمان اکتوبر اور نومبر ۱۹۶۰ء کے متعدد اوراق اس بحث میں ضائع کر دیئے کہ حضور کو اسلامی ریاست کا صدر یا مسلمانوں کا لیڈر یا قاضی اور جج کس نے بنایا تھا۔ خدا نے یا مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحث سے بالآخر آپ کا مقصد کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن

"تجدید و احیائے دین" کے مطالعہ کا موقع مل جائے وہ براہ کرم اس کا وہ حصہ نکال کر دیکھیں جو اس کے پہلے باب میں ذیلی عنوان "جاہلیت کا حملہ" کے تحت درج ہے۔ اس تقابل سے ان کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ حضرات دوسروں کی عبارتیں نقل کرنے میں کس درجہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ کتاب کے صفحات کا حوالہ خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے لیا ہے۔ قدیم ایڈیشن میں یہ بحث صفحہ ۲۲-۲۵ پر ہے اور جدید ایڈیشن میں ۳۶-۴۱ پر۔

؎۳ اگر کوئی شخص اپنی ایک کتاب میں اس کے موضوع اور بحث کے لحاظ سے یہ بتاتے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوئیں، اور کسی دوسری کتاب یا مضمون میں اس کے موضوع اور بحث کے لحاظ سے یہ بتائے کہ مسلمانوں کے اندر اصل اسلامی تعلیمات میں سے کیا کچھ محفوظ ہے۔ تو آخر کس منطق کی رو سے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد ثابت کیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں میں بگاڑ آجانے کی روداد بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ سارے مسلمان بالکل بگڑ گئے، حتیٰ کہ ان کے پاس اصل دین میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہا۔ اور دین کی جو تعلیمات مسلمانوں کے پاس محفوظ ہیں ان کی نشان دہی سے یہ مطلب نہیں نکل سکتا کہ مسلمانوں میں بگاڑ نہیں آیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریم کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کی۔ ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ اس مملکت کا اولین سربراہ اور مسلمانوں کا رہنما اور تمام معاملات کے فیصلے کرنے کی آخری اتھارٹی جس کے فیصلوں کی کہیں اپیل نہ ہو سکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟[۳۲]

کیا کسی غیر نبی کو نبی کی تمام حیثیات حاصل ہو سکتی ہیں؟ ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اگر یہ سب کچھ رسول اللہ علیہ وسلم نے ہی ہونا تھا تو قرآن کریم نے ان امور میں حضور کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بن گئے تھے۔ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوتی تھی۔ اور سیاسی یا دنیاوی امور میں حکومت کی۔ قرآن نے اس ثنویت کو مٹایا اور مسلمانوں سے کہا کہ رسول اللہ تمہارے مذہبی رہنما ہی نہیں سیاسی اور تمدنی امور میں تمہارے سربراہ بھی ہیں۔ اس لیے ان تمام امور میں آپ ہی کی اطاعت کی جائے گی۔ رسول اللہ کے بعد یہ تمام مناصب (یعنی خدا سے وحی پانے کے علاوہ دیگر مناصب) حضورؐ کے سچے جانشین (خلیفۃ الرسول) کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور اب خدا اور رسول کی اطاعت کے معنی اس نظام کی اطاعت ہو گئے جسے عام طور پر خلافت علیٰ منہاج نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کو میں نے "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا تھا جس کا آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔ مرکزِ ملت سے میری مراد ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ اور انہیں کی مثل اسلامی نظام کے دیگر سربراہ خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا آئندہ آنے والے ہوں۔ اب آپ نے کچھ سمجھا کہ

---

[۳۲] ڈاکٹر صاحب جس سوال کو ایک فضول اور لایعنی سوال قرار دے کر اس کا سامنا کرنے سے گریز فرما رہے ہیں وہ دراصل اس بحث کا ایک فیصلہ کن سوال ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرمانروا، قاضی اور رہنما تھے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ حضور کے فیصلے اور آپ کی تعلیمات وہدایات، اور آپ کے احکام منجانب اللہ تھے اور اس بنا پر لازماً وہ اسلام میں سند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے طنز اور استہزاء کی نشتر کہاں تک پہنچی ہے[۴۵]

حجت (AUTHORITY) ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص حضور کی ان چیزوں کو سند و حجت نہیں مانتا تو اسے دو باتوں میں سے ایک بات لامحالہ کہنی پڑے گی۔ یا تو وہ یہ کہے کہ حضور خود فرمانروا اور قاضی اور رہنما بن بیٹھے تھے۔ یا پھر یہ کہے کہ مسلمانوں نے آپ کو ان مناصب کے لیے اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا اور وہ حضور کی موجودگی میں آپ کے بجائے کسی اور کو بھی منتخب کر دینے کے مجاز تھے اور ان کو یہ بھی حق تھا کہ آپ کو معزول کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب اور تمام منکرینِ حدیث پہلی بات ماننا نہیں چاہتے، کیونکہ اس کو مان لیں تو ان کے مسلک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن دوسری دونوں باتوں میں سے کسی بات کو بھی صاف صاف کہدینے کی ان میں ہمت نہیں ہے، کیونکہ اس کے بعد اس دامِ فریب کا تار تار الگ ہو جاتے گا جس میں وہ مسلمانوں کو پھانسنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے یہ حضرات اس سوال سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناظرین براہِ کرم اس کتاب کے صفحات ۷۹-۸۱ پر "مرکزِ ملت" کی بحث ملاحظہ فرمالیں اور پھر دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب میرے اٹھائے ہوئے سوالات سے بچ کر کس طرح راہِ گریز اختیار فرما رہے ہیں۔

[۴۸] اِس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ حاملِ وحی ہونے کے سوا باقی جتنی حیثیات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی نظام میں حاصل تھیں وہ سب آپ کے بعد خلیفہ یا "مرکزِ ملت" کو منتقل ہوگئیں؟ کیا قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح کی ہے؟ یا خلفائے راشدین نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم کو یہ حیثیت حاصل ہے؟ یا عہدِ رسالت سے لیکر آج تک علمائے امت میں سے کسی قابلِ ذکر آدمی کا مسلک یہ رہا ہے؟ قرآنِ مجید جو کچھ کہتا ہے وہ اس کتاب کے صفحات ۶۱-۶۹ پر میں پیش کر چکا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو یہ لوگ مانتے نہیں، ورنہ میں بکثرت مستند و معتبر احادیث پیش کرتا جن سے اس دعوے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدین کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت پر فائز سمجھتے تھے۔ مگر میں نے اسی کتاب کے صفحات ۹۴-۹۸ پر حضرت ابوبکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی نظام کے امیر اور منکرینِ حدیث کے "مرکزِ ملت" کا عظیم فرق

یہ جو میں نے کہا ہے کہ "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی نظام ہے تو یہ میری اختراع نہیں۔ اس کے مجرم آپ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں سورہ مائدہ کی آیت اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ (۵/۳۳) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جاتا ہے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔" (جلد اول صفحہ ۴۶۵)

ذرا سوچیے کہ اگر میں "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی حکومت لوں تو ہدفِ طعن و تشنیع بن جاؤں اور اس سے آپ وہی مراد لیں تو مفسرِ قرآن کہلائیں۔[۹۳]

عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے اپنے اقوال لفظ بلفظ پیش کر دیتے ہیں جن سے یہ جھوٹا الزام ان پر ثابت نہیں ہوتا۔ اب ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم مشرب اصحاب کم از کم یہی بتا دیں کہ پچھلی چودہ صدیوں میں کب کس عالم دین نے یہ بات کہی ہے۔

۹۳ یہاں پھر ڈاکٹر صاحب نے میرے سامنے میری ہی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس نظام صالح کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے ہو، دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے، بادشاہ کے خلاف لڑائی (WAGING WAR AGAINST THE KING)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت امت کے

کا مجرم قرار دیا گیا۔ چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوا اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو؟

اب ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی خود دیکھ سکتا ہے کہ بادشاہ کی نمائندگی کرنے والے سپاہی کے خلاف جنگ کو بادشاہ کے خلاف جنگ قرار دینے۔ اور سپاہی کو خود بادشاہ قرار دے دینے میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایسا ہی عظیم فرق ان دو باتوں میں ہے کہ ایک شخص اللہ اور رسول کے نظامِ مطلوب کو چلانے والی حکومت کے خلاف کارروائی کو اللہ اور رسول کے خلاف کارروائی قرار دے اور دوسرا شخص دعویٰ کرے کہ یہ حکومت خود اللہ اور رسول ہے۔ اس فرق کی نزاکت پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک آپ ان دونوں کے نتائج پر تھوڑا سا غور نہ کریں۔ فرض کیجیے کہ اسلامی حکومت کسی وقت ایک غلط حکم دے بیٹھتی ہے جو قرآن اور سنت کے خلاف پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال میں میری تعبیر کے مطابق تو عام مسلمانوں کو اٹھ کر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ آپ اپنا حکم واپس لیجیے، کیونکہ آپ نے اللہ اور رسول کے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے۔ اللہ نے قرآن میں یہ فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے، اور آپ اس سے ہٹ کر یہ حکم دے رہے ہیں، لہٰذا آپ اس معاملہ میں اللہ اور رسولؐ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔ مگر منکرینِ حدیث کی تعبیر کے مطابق اسلامی حکومت خود ہی اللہ اور رسول ہے۔ لہٰذا مسلمان اس کے کسی حکم کے خلاف بھی یہ استدلال لانے کا حق نہیں رکھتے۔ جس وقت وہ یہ استدلال کریں گے اسی وقت حکومت یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دے گی کہ اللہ اور رسول تو ہم خود ہیں، جو کچھ ہم کہیں اور کریں وہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

منکرینِ حدیث دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں "اللہ اور رسول" کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد اسلامی حکومت ہے۔ میں ناظرین سے عرض کروں گا کہ ذرا قرآن کھول کر وہ آیتیں نکال لیجیے جن میں اللہ اور رسول کے الفاظ ایک ساتھ آتے ہیں اور خود دیکھ لیجیے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے "خدا اور رسول" کی اطاعت کے مرادف تھی یا نہیں؟

عہد رسالت میں مشاورت کے حدود | ۱۵۔ آپ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کو جو خدا نے صدر ریاست یا جج مقرر کیا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپ کا ہر فیصلہ وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ خود آپ کے بیانات کے خلاف ہو جاتا ہے سب سے پہلے تو یہ کہ صدر ریاست کی حیثیت سے آپ کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم خود خدا نے دیا تھا۔ اس ضمن میں آپ نے تحریر فرمایا ہے:

> "اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ

یہاں حکومت سے مراد لینے کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:
آل عمران آیت ۳۲۔ النساء ۱۰۰ و ۱۳۶۔ المائدہ ۱۱۱۔ الاعراف ۱۵۸۔ التوبہ ۲۹، ۵۴، ۶۲، ۶۳، ۸۰، ۸۴۔ النور ۴۷۔ احزاب ۳۶، ۶۵، ۶۶۔ محمد ۳۳۔ الفتح ۱۳۔ الحجرات ۱۵۔ الجن ۲۳۔ ان آیات کو جو شخص بھی بغور پڑھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اللہ اور رسول کے معنی حکومت ہو جائیں تو دین اسلام کا حلیہ بگڑ جاتا ہے اور ایک ایسی بدترین ڈکٹیٹر شپ اس بنیاد پر قائم ہو جاتی ہے جس کے سامنے فرعون، چنگیز، ہٹلر، مسولینی اور اسٹالین کی آمریتیں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پھر ذرا اس پہلو پر غور کیجیے کہ بنی امیہ کے بعد سے آج تک ساری دنیائے اسلام کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک حکومت میں جمع نہیں ہوئی ہے اور آج بھی مسلم ممالک میں بہت سی حکومتیں قائم ہیں اب کیا انڈونیشیا، ملایا، پاکستان، ایران، ترکی، عرب، مصر، لیبیا، تونس اور مراکش میں سے ہر ایک کے "اللہ اور رسول" الگ الگ ہو گئے؟ یا کسی ایک ملک کے "اللہ اور رسول" زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں پر مسلط کریں گے؟ یا اسلام اس وقت تک پورا کا پورا معطل رہے جب تک پوری دنیائے اسلام متفق ہو کر ایک "اللہ اور رسول" کا انتخاب نہ کر لے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کرے (ترجمان القرآن دسمبر ۵۸ء صفحہ ۲۰۰)

سوال یہ ہے کہ اگر بحیثیت صدر ریاست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم وحی پر مبنی ہوتا تھا تو پھر آپ کو مشورے کا حکم کیوں دیا گیا تھا؟ آپ نے زیر نظر خط و کتابت میں اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ حضور نے مشاورت صرف تدابیر کے معاملہ میں کی ہے۔ آپ اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضور نے اپنی تئیس سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ کہا یا کیا وہ سب وحی کی بنا پر تھا۔ اور اب آپ "تدابیر" کو اس سے خارج کر رہے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے:

"کیا آپ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں قرآن کے کسی حصے کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو۔ یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرما دیں"

اول تو مجھے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ خدا نے حضور کو مشورے کا حکم دیا تھا۔ اور میرا ایمان ہے کہ حضور نے اس حکم کی یقیناً تعمیل فرمائی۔ اب رہا یہ سوال کہ آپ نے کن معاملات میں مشورہ کیا؟ تو قرآن نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ اس لیے قرآن کے اصولی احکام کی تفاصیل کے تعین میں حضور نے مشورہ کیا ہو گا۔

اذان کا طریقہ مشورے سے طے ہوا تھا یا الہام سے؟ اس کی ایک مثال تو ہمیں مشکوٰۃ شریف

نوٹ: اس ساری بحث کا جواب یہ ہے کہ جن معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعہ سے حضور کی رہنمائی نہ کرتا تھا ان میں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق حضور یہ سمجھتے تھے کہ اسے انسانی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔ اور ایسے معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے فیصلے فرماتے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضور کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلامی طریق مشاورت کی تربیت دی جائے۔ مسلمانوں کو اس طرح کی تربیت دینا بھی منصب رسالت ہی کا ایک حصہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا۔[۱۹۹] لیکن خود اس دعوت کے طریق کو متعین نہیں کیا۔ اس کا تعین حضورؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے کیا اور اپنی رائے کے خلاف کیا۔ کیونکہ آپ نے پہلے ناقوس بجانے کا حکم دیا تھا۔ فرمائیے اذان دین کے احکام میں داخل ہے یا نہیں؟[۲۰۰]

---

[۱۹۹] کیا قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا گیا ہو؟ قرآن مجید میں تو نماز کی منادی کا ذکر صرف دو آیتوں میں آیا ہے۔ سورۂ مائدہ، آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے کہ "جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اہل کتاب اور کفار اس کا مذاق اُڑاتے ہیں"۔ اور سورۂ جمعہ آیت ۹ میں ارشاد ہوا ہے "جب جمعہ کے روز نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو"۔ اِن دونوں آیتوں میں نماز کی منادی کا ذکر ایک رائج شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ہم کو قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں حکم دیا گیا ہو کہ نماز کی منادی کرو۔

[۲۰۰] معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مشکوٰۃ پڑھی نہیں ہے۔ صرف سنی سنائی بات یہاں نقل فرما دی ہے۔ مشکوٰۃ کی کتاب الصلوٰۃ میں باب الاذان نکال کر دیکھیے۔ اس میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جب نماز باجماعت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تو اول اوّل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت اس بارے میں نہیں آئی تھی کہ نماز کے لیے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ حضورؐ نے صحابۂ کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ آگ جلائی جائے تاکہ اس کا دھواں بلند ہوتے دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے ناقوس بجانے کی رائے دی لیکن کچھ اور لوگوں نے کہا کہ پہلا طریقہ یہود کا اور دوسرا نصاریٰ کا ہے۔ ابھی اس معاملہ میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہوا تھا اور اسے سوچا جا رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن زید انصاری نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ناقوس لیے جا رہا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا، اے بندۂ خدا، یہ ناقوس بیچتا ہے؟ اس نے پوچھا اس کا کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا نماز کے لیے لوگوں کو بلائیں گے۔ اس نے کہا میں اس سے اچھا طریقہ تمہیں بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اذان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضورؐ کے فیصلے سند اور حجت ہیں یا نہیں ۱۶۔ اب رہے حضورؐ کے فیصلے بحیثیت جج کے تو آپ کے دعوے کے مطابق حضورؐ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہونا چاہیے لیکن آپ کو خود اس کا اعتراف ہے کہ آپ کے یہ فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۴۸ پر یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"میں بہر حال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے"۔[۴۳]

الفاظ انہیں بتاتے۔ صبح ہوئی تو حضرت عبداللہ نے آکر حضورؐ کو اپنا خواب سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، اٹھو اور بلالؓ کو ایک ایک لفظ بتاتے جاؤ، یہ بلند آواز سے پکارتے جائیں گے۔ جب اذان کی آواز بلند ہوئی تو حضرت عمرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم آج میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا فللہ الحمد۔ یہ ہے مشکوٰۃ کی احادیث در باب اذان کا خلاصہ۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے اذان دینے کا طریقہ مشورے سے نہیں طے ہوا بلکہ الہام سے ہوا ہے، اور یہ الہام بصورت خواب حضرت عبداللہؓ بن زید اور حضرت عمرؓ پر ہوا تھا۔ لیکن مشکوٰۃ کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جس روز ان صحابیوں کو خواب میں اذان کی ہدایت ملی اسی روز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی بذریعہ وحی یہ حکم آگیا تھا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجرؒ نے ان روایات کو جمع کر دیا ہے۔

۴۳ یہ سخن فہمی کے فقدان کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ جو شخص قانونی مسائل سے سرسری واقفیت ہی رکھتا ہو وہ بھی اس بات کو جانتا ہے کہ مقدمے کے فیصلے میں دو چیزیں الگ الگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضور کے فیصلوں کی یہی امکانی غلطیاں تھیں جن کے متعلق قرآن کریم نے حضور کی

ہوتی ہیں۔ ایک واقعاتِ مقدمہ (FACTS OF THE CASE) جو شہادتوں اور قرائن سے متحقق ہوتے ہیں۔ دوسرے، ان واقعات پر قانون کا انطباق یعنی یہ طے کرنا کہ جو واقعات رُودادِ مقدمہ سے معلوم ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے اس مقدمے میں قانونی حکم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ مَیں قانون کو واقعاتِ مقدمہ پر منطبق کرنے میں غلطی کر سکتا ہوں، بلکہ آپ کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم غلط رُوداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف واقعاتِ مقدمہ ثابت کر دو گے تو میں انہی پر قانون کو منطبق کر دوں گا اور خدا کے ہاں اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ اس لیے کہ جج کا کام اسی رُوداد پر فیصلہ کرنا ہے جو فریقین کے بیانات اور شہادتوں سے اس کے سامنے آئے۔ کسی دوسرے خارجی ذریعہ سے اس کو حقیقتِ حال معلوم بھی ہو تو وہ اپنی ذاتی معلومات پر فیصلے کی بنا نہیں رکھ سکتا بلکہ اصولِ انصاف کی رُو سے اس کو رُودادِ مقدمہ ہی پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا غلط رُوداد پر جو فیصلہ ہوگا وہ جج کی غلطی نہیں ہے بلکہ اس فریق کی غلطی ہے جس نے خلافِ حقیقت واقعات ثابت کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرایا۔ اس سے وہ بات کہاں نکل آئی جو ڈاکٹر صاحب نکالنا چاہتے ہیں؟ آخر یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مقدمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی واقعاتِ مقدمہ بتایا کرتا تھا؟ اصل دعویٰ تو یہ ہے کہ حضورؐ قانون کی تعبیر اور حقائق پر ان کے انطباق میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ مامور من اللہ قاضی تھے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی اس کام میں آپ کی رہنمائی کرتی تھی، اور اس بنا پر آپ کے فیصلے سند اور حجت ہیں۔ اس دعوے کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو وہ سامنے لائے۔

۴۴ اوپر جس حدیث سے ڈاکٹر صاحب نے استدلال فرمایا ہے اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "میں فیصلے میں غلطی کر سکتا ہوں"۔ علمِ قانون میں بھی یہ بات پوری طرح مسلّم ہے کہ اگر عدالت کے سامنے کوئی شخص شہادتوں سے خلافِ واقعہ باتوں کو واقعی ثابت کر دے اور جج ان کو تسلیم کر کے ٹھیک قانون کے مطابق فیصلہ دے دے تو وہ فیصلہ بجائے خود غلط نہیں ہوگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اسے فیصلے کی غلطی قرار دے رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانِ مبارک سے کہلوایا تھا کہ "اگر میں غلطی کرتا ہوں تو وہ میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو وہ وحی کی بنا پر ہوتا ہے۔" آپ نے محض اپنی بات کی پچ میں اس آیت کو جس طرح مسخ کیا ہے اس پر علم روتا ہے اور عقل ہنستی ہے[۴۵]۔

۱۷- میں نے یہ پوچھا تھا کہ اگر حضور کا ہر فیصلہ بربنائے وحی ہوتا تھا تو آپ کی جن لغزشوں پر قرآن میں تادیب آئی ہے وہ لغزشیں کیوں سرزد ہوئی تھیں؟

آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں صرف وہی چند لغزشیں ہوئی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی۔ آپ بار بار اسے دُہراتے ہیں کہ حضور نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا اور یہ آغازِ اسلام سے آج تک مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے[۴۶]۔

کج بحثی کی ایک دلچسپ مثال آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور سے صرف چند لغزشیں ہوئی تھیں یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر حضور سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابلِ اعتراض تھی لیکن چند لغزشیں قابلِ اعتراض نہیں ہے[۴۷]۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ حقیقت تھی

---

[۴۵] اِس کتاب کے صفحات ۸۶-۸۷ کو پلٹ کر ایک دفعہ پھر دیکھ لیجیے۔ آیت قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ کا مطلب سمجھنے میں ڈاکٹر صاحب نے جو غلطی کی تھی اسے کتنے معقول دلائل کے ساتھ انہیں سمجھایا گیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب اب بھی اپنی اسی غلطی پر مُصر ہیں۔ اب "علم" اور عقل خود ہی فیصلہ کریں کہ انہیں کس پر رونا اور کس پر ہنسنا ہے۔

[۴۶] یہ بحث بھی آپ اسی کتاب کے صفحات ۸۷-۸۸ اور ۱۲۰-۱۲۱ پر نکال کر پھر ایک دفعہ پڑھ لیں اور خود رائے قائم کریں کہ ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کہاں تک معقول ہے۔

[۴۷] کس قدر نفیس خلاصہ ہے جو میری تحریر سے نکال کر خود میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس عبارت کا یہ خلاصہ نکالا گیا ہے وہ بلفظہ یہ ہے:

© rasailojaraid.com

کہ حضور کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی تھی تو حضور کی ایک لغزش بھی دین کے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس لیے کہ وہ غلطی کسی انسان کی غلطی نہیں تھی — بلکہ (معاذ اللہ) وحی کی غلطی تھی۔ خود خدا کی غلطی تھی۔ اور اگر (معاذ اللہ) خدا بھی غلطی کر سکتا ہے تو ایسے خدا پر ایمان کے کیا معنی ہو سکتے ہیں[47]؟ اللہ آپ لوگوں کے فتنے سے اپنے دین کو

" دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار رہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اُس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔"

اس کا خلاصہ یہ نکالا گیا ہے کہ "حضورؐ سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابلِ اعتراض تھی، لیکن چند لغزشیں قابلِ اعتراض نہیں ہیں"۔ یہ طرزِ بحث جن لوگوں کا ہے ان کے بارے میں کس طرح آدمی یہ حسنِ ظن رکھ سکتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ بات سمجھنے کے لیے گفتگو کرتے ہیں۔

۴۸ یہ ایک مغالطے کے سوا اور کیا ہے آخر یہ کس نے کہا کہ وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے غلط رہنمائی کی تھی اس بنا پر حضورؐ سے لغزش ہوئی۔ اصل بات، جس کو ہٹ دھرمی کے بغیر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ حضورؐ کی ایک لغزش بھی چونکہ دین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دینے کے لیے کافی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا کہ نبوت کے فرائض کی بجاآوری میں خود آپ کی رہنمائی و نگرانی کرے گا، اور اگر کسی وقت بتقاضائے بشریت آپ سے کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً اس کی اصلاح فرما دے گا تاکہ دین میں کوئی خامی باقی نہ رہ سکے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محفوظ رکھے جنہیں اپنی امارت کے نشے میں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ ان کی بدمستیوں سے کس کس کی پگڑی اچھلتی ہے۔

حضورؐ کے ذاتی خیال اور بربنائے وحی کہی جانے والی بات میں واضح امتیاز تھا	۱۸۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بنا پر تھا۔

لیکن دجال سے متعلق احادیث کے سلسلے میں آپ کا ارشاد یہ ہے کہ

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں۔ جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔"

(رسائل و مسائل صفحہ ۵۵)

اور اس کے بعد آپ خود ہی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ

"حضورؐ کا یہ تردد تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپؐ نے علمِ وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں۔"[۴۹] (ایضاً صفحہ ۵۶)

---

[۴۹] میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے یہاں سہارا لیا ہے ان کو نقل کرنے میں پھر وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکال کر اپنا مطلب برآمد کر لیا گیا۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ دجال کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے جو علم دیا گیا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ وہ آئے گا اور ان صفات کا حامل ہوگا انہی باتوں کو حضورؐ نے خبر کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کب اور کہاں آئیگا تو اس کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی علم نہیں دیا گیا تھا۔ اسی لیے ان امور کے متعلق جو کچھ آپؐ نے بیان فرمایا ہے وہ خبر کے انداز میں نہیں بلکہ قیاس و گمان کے انداز میں فرمایا ہے مثال کے طور پر ابن صیاد کے متعلق آپؐ نے شبہ ظاہر فرمایا کہ شاید یہ دجال ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ دجال ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو، اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا صحابہ اس بات کے قائل تھے کہ حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں؟

۱۹۔ میں نے لکھا تھا کہ کئی ایسے فیصلے تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں ہوئے لیکن حضورؐ کے بعد جب تغیرِ حالات کا تقاضا ہُوا تو خلفائے راشدین نے ان فیصلوں کو بدل دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ان بزرگوں پر سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں آپ نہ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل۔ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ اس باب میں خود آپ نے ایک ہی صفحہ آگے چل کر اس امر کا بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے کہ صحابہ کیا حضورؐ کے فیصلے کو تغیرِ حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے۔ سنیئے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔

> "کس کو معلوم نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیشِ اسامہؓ کو بھیجنے پر صرف اس لیے اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام نے جب ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا ہُوا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اُچک لے جائیں تو میں اس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسول اللہ نے کر دیا تھا" (ترجمان، نومبر ۵۸ء صفحہ ۱۱۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا باقی تمام صحابہؓ اس بات کو جائز

دجال میری زندگی میں آگیا تو میں بحجت سے اس کا مقابلہ کروں گا، ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ وحی کے ذریعہ سے ملے ہوئے علم کو ایک انداز میں بیان فرماتے تھے اور جن باتوں کا علم آپ کو وحی کے ذریعہ سے نہیں دیا جاتا تھا ان کا ذکر بالکل مختلف انداز میں کرتے تھے۔ آپؐ کا طرزِ بیان ہی اس فرق کو واضح کر دیتا تھا لیکن جہاں صحابہ کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آتی تھی وہاں وہ خود آپ سے پوچھ لیتے تھے کہ یہ بات آپ اپنی رائے سے فرما رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اس کی متعدد مثالیں میں نے تفہیمات حصہ اول کے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ رسول اللہ کے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے:

"حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں۔ کیونکہ بڑے بڑے صحابہؓ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے! تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے، رسول اللہ نے اس کو مقرر کیا اور تو کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں۔" (ایضاً)

اس سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ اس کے قائل تھے کہ تغیر حالات سے حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اس واقعہ میں تغیر حالات کا بھی سوال نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ اسے اس لیے بدلنا چاہتے تھے کہ اس سے صحابہؓ خوش نہیں تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایک حضرت ابوبکرؓ کے سوا صحابہؓ میں سے کوئی بھی اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کسی حالت میں بھی بدلے نہیں جا سکتے؟[۹ع]

۹ع یہ ایک اور مثال ہے اس بات کی کہ ڈاکٹر صاحب ہر عبارت میں صرف اپنا مطلب تلاش کرتے ہیں۔ اوپر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے جو دو واقعات ڈاکٹر صاحب نے نقل کیے ہیں ان کو پھر پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں یہ بات بھی کہیں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے، یا صحابۂ کرام میں سے کسی نے یہ کہا ہو کہ "اے حضور مرکز ملت، آپ از روئے شرع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے پابند نہیں ہیں بلکہ انہیں بدل دینے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر آپ کی اپنی رائے یہی ہے کہ اس وقت جیش اسامہؓ کو جانا چاہیے اور اسامہ ہی اس کے قائد ہوں تو بات دوسری ہے۔ آپ اس پر عمل فرمائیں کیونکہ آپؐ 'اللہ و رسول' ہیں، لیکن یہ استدلال نہ فرمائیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے اس لیے اسے نہیں بدلا جا سکتا۔ حضور اپنے زمانے کے مرکز ملت تھے اور آپ اپنے زمانے کے مرکز ملت ہیں۔ آج آپ کے اختیارات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسئلہ طلاقِ ثلاثہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کی اصل صورت | ۲۰ - آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی مثال پیش کروں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کسی فیصلے کو خلفائے راشدین نے بدلا ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مضمون میں اس قسم کی مثالیں پیش کی تھیں لیکن چونکہ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں اس لیے میں اسے شہادت میں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن حسبِ ذیل واقعات سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے۔

۱ - نبی اکرم کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاق مغلظہ قرار دے دیا اور فقہ کی رُو سے امت آج تک اسی پر عمل کر رہی ہے۔ ؎

وہی ہیں جو کل حضور کو حاصل تھے" یہ بات اگر حضرت عمرؓ یا دوسرے صحابہؓ نے کہی ہوتی تو بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی بات بن جاتی۔ لیکن اس کے برعکس وہاں معاملہ یہ پیش آیا کہ جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضور کے فیصلے کا حوالہ دیا اُسی وقت حضرت عمرؓ نے بھی اور صحابہؓ نے بھی سرِ اطاعت جھکا دیا۔ جیشِ اسامہؓ روانہ ہوا، اُسامہ ہی اس کے قائد رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان کی قیادت میں راضی خوشی چلے گئے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی تھی کہ آپ کے انتظامی فیصلوں میں حسبِ ضرورت ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت دین کے فہم میں جو شخص سب سے بڑھا ہوا تھا اُس کے متنبہ کرنے پر سب نے اپنی غلطی محسوس کر لی اور سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہ طرزِ عمل سخت افسوسناک ہے کہ محض اپنی بات بنانے کی خاطر صحابہؓ کرام کے ان تاثرات کا تو سہارا لے لیا جاتا ہے جن کا اظہار نفسِ بحث کے دوران میں ہوا ہو لیکن اس اجماعی فیصلے سے آنکھیں بند کر لی جائیں جس پر بحث کے بعد آخرکار سب کا اتفاق ہو گیا ہو۔ دنیا بھر کا مسلّم قاعدہ تو یہ ہے کہ ایک بحث کے بعد جو بات متفق علیہ طور پر طے ہو وہی طے شدہ فیصلہ قابلِ حجت ہے نہ کہ وہ آراء جو اثنائے بحث میں سامنے آئی ہوں۔

؎ اس معاملہ میں صحیح پوزیشن [illegible] میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مؤلفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے استدلال کی نوعیت

"۲- حضورؐ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا۔[لے]

اور متعدد مقدمات میں حضورؐ نے ان کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے۔ لیکن جو شخص تین مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا اس کی طرف سے اگر یہ عذر پیش کیا جاتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے یہ لفظ محض تاکیداً استعمال کیا تھا۔ اس کے عذر کو حضورؐ قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دیکر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ اب یہ طلاق کا معاملہ کھیل بنتا جا رہا ہے اس لیے ہم اس عذر کو قبول نہیں کریں گے اور تینوں طلاقوں کو تین ہی کی حیثیت سے نافذ کر دیں گے۔ اس کو تمام صحابہؓ نے بالاتفاق قبول کیا اور بعد میں تابعین و ائمہ مجتہدین بھی اس پر متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت عمرؓ نے عہد رسالت کے قانون میں یہ کوئی ترمیم کی ہے۔ اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار قاضی کی اس رائے پر ہے کہ جو شخص اپنی نیت بیان کر رہا ہے وہ صادق القول ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں اس طرح کا عذر مدینہ طیبہ کے اکا دکا جانے پہچانے آدمیوں نے کیا تھا اس لیے حضورؐ نے ان کو راستباز آدمی سمجھ کر ان کی بات قبول کر لی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے ہر شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ کثرت لوگوں نے تین طلاق دیکر ایک طلاق کی نیت کا دعوی کرنا شروع کر دیا ہو۔

لے اسے اگر کوئی شخص فیصلوں میں رد و بدل کی مثال سمجھتا ہے تو اسے دعوی یہ کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں بھی مرکز ملت صاحب رد و بدل کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ حضورؐ نے کسی حدیث میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مقرر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ توبہ آیت ۶۰)۔ ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا لینے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا مفتوحہ اراضی کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ حکمِ رسولؐ کے خلاف تھا؟

۳ - نبی اکرمؐ کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس سسٹم کو ختم کر دیا۔

کیفیت اگر منکرینِ حدیث پر طاری نہ ہو اور وہ اس معاملہ کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو خود لفظ "مؤلفۃ القلوب" پر تھوڑا سا غور کر کے اسے خود سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لفظ آپ ہی اپنا یہ مفہوم ظاہر کر رہا ہے کہ صدقات میں سے اُن لوگوں کو بھی روپیہ دیا جا سکتا ہے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ حضورؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیفِ قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے حضورؐ اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اب ہماری حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ ہمیں اس غرض کے لیے کسی کو روپیہ دینے کی حاجت نہیں ہے لہٰذا ہم اس مد میں کوئی روپیہ صرف نہیں کریں گے۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا کوئی فیصلہ بدل ڈالا؟ کیا واقعی حضورؐ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیفِ قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو، بہرحال کچھ لوگوں کو ضرور مؤلفۃ القلوب قرار دیا جاتے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے؟ کیا خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ صدقات کا ایک حصہ تالیفِ قلب کی مد پر ہر حال میں ضروری خرچ کیا جائے؟

۲ - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ زمینیں ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں۔ اگر ایسا کوئی حکم حضورؐ نے دیا ہوتا اور حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے حضورؐ کا فیصلہ بدل دیا۔ یا پھر یہ دعویٰ اُس صورت میں کیا جا سکتا تھا جبکہ حضرت عمرؓ نے انہی زمینوں کو مجاہدین سے واپس لے لیا ہوتا جنہیں حضورؐ نے اپنے عہد میں تقسیم کیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہیں آئی۔ اصل صورتِ معاملہ یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین ہی میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسبِ موقع و ضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور غلط نظیر ۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے وظائف مساوی مقرر فرمائے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں خدمات کی نسبت سے بدل دیا۔[۵۳]

یہ اور اس قسم کی کئی اور مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے فیصلے تغیر حالات کے مطابق خلافت راشدہ میں بدلے گئے تھے۔[۵۴]

کیا قرآن کے معاشی احکام عبوری دور کے لیے ہیں؟ ۲۱۔ مؤلفۃ القلوب کی امداد بند کر دینے کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ آپ نے میری اس بات کا بھی مذاق اڑایا ہے کہ قرآن کے جو احکام بعض شرائط سے مشروط ہوں جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام اس وقت تک ملتوی ہو جاتے ہیں جب تک ویسے ہی حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ انہیں "عبوری دور" کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صدقات کی مد سے مؤلفۃ القلوب کو امداد دینے کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ اس مد کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ حکم اس عبوری دور تک تھا جب تک نظام کو اس قسم کی تالیف قلوب کی ضرورت تھی۔ اب وہ ضرورت باقی نہیں رہی اس لیے

ہر ایک کا بندوبست عہد رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا اور ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ ایسی اراضی کا بندوبست لازماً فلاں طریقے یا طریقوں ہی پر کیا جائے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے مشورہ سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا اسے حضورؐ کے فیصلوں میں رد و بدل کی مثال نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۵۳؎ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حضورؐ نے مساوی وظائف مقرر فرمائے تھے؟ تاریخ کی رو سے تو یہ حضرت ابوبکرؓ کا فعل تھا۔ اس لیے اسے اگر کسی چیز کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک خلیفہ اپنے سے پہلے خلیفہ کے فیصلوں میں رد و بدل کرنے کا مجاز ہے۔

۵۴؎ میں عرض کرتا ہوں کہ تمام منکرین حدیث مل کر ان مثالوں کی ایک مکمل فہرست پیش فرما دیں میں انشاء اللہ ثابت کر دوں گا کہ ان میں سے ایک بھی اس امر کی مثال نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں حضورؐ کے فیصلے بدلے گئے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس حکم پر عمل کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہی منشا ہوتا ہے ان لوگوں کا جو قرآن کے اس قسم کے احکام کو "عبوری دور کے احکام" کہتے ہیں[۵۵]۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اسے سمجھ

---

۵۵ اس سخن سازی سے درحقیقت بات نہیں بنتی۔ منکرین حدیث شخصی ملکیت کے بارے میں پورا پورا کمیونسٹ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے "قرآنی نظامِ ربوبیت" رکھا ہے۔ اس کے متعلق جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معاشی نظام کے متعلق جتنے بھی احکام صراحۃً یا اشارۃً وکنایۃً آئے ہیں وہ سب شخصی ملکیت کا اثبات کرتے ہیں اور کوئی ایک حکم بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا جو شخصی ملکیت کی نفی پر مبنی ہو یا اسے ختم کرنے کا منشا ظاہر کرتا ہو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ سب احکام عبوری دَور کے لیے ہیں۔ بالفاظ دیگر جب یہ عبوری دَور ختم ہو جائے گا اور اِن حضرات کا تصنیف کردہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا تو یہ سب احکام منسوخ ہو جائیں گے۔ جناب پرویز صاحب صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

> "سوال کیا جاتا ہے کہ اگر قرآن کا نظامِ معاشی اس قسم کا ہے تو پھر اس نے صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام کیوں دیئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس نظام کو یک لخت نہیں لے آنا چاہتا تھا، بتدریج قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام اس عبوری دَور سے متعلق ہیں جس میں ہنوز یہ نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔"

(ملاحظہ ہو بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ میں پیش کردہ مقالہ "اسلامی نظام میں معاشیات")

لیکن یہ حضرات قرآن میں کہیں یہ نہیں دکھا سکتے کہ ان کے بیان کردہ نظامِ ربوبیت کا کوئی نقشہ اللہ تعالیٰ نے پیش کیا ہو اور اس کے متعلق احکام دیے ہوں اور یہ ارشاد فرمایا ہو کہ ہمارا اصل مقصد تو یہی نظامِ ربوبیت قائم کرنا ہے۔ البتہ صدقہ و خیرات اور وراثت وغیرہ کے احکام ہم اُس وقت تک کے لیے دے رہے ہیں جب تک یہ نظام قائم نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ ان حضرات نے خود گھڑ لیا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآن کے واضح اور قطعی احکام کو یہ عبوری دور کے احکام قرار دیکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لینے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کی انانیت آپ کو اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔

اور اس کے تو آپ خود بھی قائل ہیں کہ شریعت کا ایک حتمی فیصلہ بھی حالات کے سازگار ہونے تک ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً آئینِ پاکستان کے سلسلے میں آپ نے کہا تھا کہ "ایک اسلامی ریاست کے نظم کو چلانے میں غیر مسلموں کی شرکت شرعاً اور عقلاً دونوں طور پر صحیح نہیں لیکن سردست ایک عارضی بندوبست کی حیثیت سے ہم اس کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کو ملک کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے[56]۔"

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۳۰-۴۳۱)

۲۲- ایک سوال یہ بھی سامنے آیا | نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف شارحِ قرآن ہی ہیں یا شارع بھی؟

صاف اڑا دینا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ کو آخر کیا نسبت ہے اُس بات سے جو حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کے بارے میں فرمائی تھی۔ اس کا منشا تو صرف یہ تھا کہ جب تک ہمیں تالیفِ قلب کے لیے ان لوگوں کو روپیہ دینے کی ضرورت تھی ہم دیتے تھے۔ اب اس کی حاجت نہیں ہے اس لیے اب ہم انہیں نہیں دینگے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں فقراء و مساکین کو صدقہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق ہم ایک شخص کو اسی وقت تک زکوٰۃ دیں گے جب تک وہ فقیر و مسکین رہے۔ جب اس کی یہ حالت نہ رہے گی تو ہم اسے دینا بند کر دیں گے۔ اس بات میں اور پرویز صاحب کے نظریہ "عبوری دور" میں کوئی دُور کی مناسبت بھی نہیں ہے۔

[56] یہ معاملہ بھی منکرینِ حدیث کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ غیر مسلموں کے متعلق تو ہمیں ثبت طور پر معلوم ہے کہ اسلام اپنا نظامِ حکومت چلانے کی ذمہ داری میں انہیں شریک نہیں کرتا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس پالیسی کو نافذ کریں۔ اور جب تک ہم اسے نافذ کرنے پر قادر نہیں ہوتے اس وقت تک مجبوراً جو کچھ بھی کریں ایک عارضی انتظام کی حیثیت سے کریں۔ بخلاف اس کے منکرینِ حدیث ایک [illegible] نصب [illegible] کرتے ہیں جس کے متعلق قرآن کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ یا وہ قرآنی احکام کی فہرست میں اضافہ بھی کرتی ہے؟ آپ نے جولائی کے ترجمان میں لکھا ہے:

"مثلاً قرآن اقامت صلوٰۃ کا حکم دے کر رہ جاتا ہے یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔ اس غرض کے لیے سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان اور نماز با جماعت کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین اور ان کی عملی صورت اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔" (صفحہ ۲۴۲)

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے جن باتوں کا اصولی طور پر حکم دیا سنت نے ان کی جزئیات متعین کر دیں۔ یہ نہیں کہ کچھ احکام قرآن نے دیئے اور اس فہرست میں سنت نے اس قسم کے مزید احکام کا اضافہ کر دیا۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قرآنی احکام نے جو فہرست دی وہ نامکمل تھی۔ سنت نے مزید اضافہ سے اس فہرست کی تکمیل کر دی۔ لیکن آپ نے جہاں ایک جگہ پہلی صورت بیان کی ہے دوسرے مقام پر دوسری شکل بھی بیان کر دی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ (اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ آپ شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں) مثلاً آپ لکھتے ہیں:

"قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۶۰، صفحہ ۴۶)

آپ تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی پوچھیے کہ (بقول آپ کے) رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی حرام ہے۔ قرآن کے

کوئی ایک مثبت حکم بھی وہ نہیں دکھا سکتے۔ اور شخصی ملکیت کے اثبات پر جو واضح اور قطعی احکام قرآن میں ہیں ان کو وہ عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکم (یعنی دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے) کی توضیح وتشریح ہے یا محرّمات کی قرآنی فہرست میں اضافہ ہے۔ ہر سمجھ دار شخص (بشرطیکہ وہ آپ کی طرح ضدّی نہ ہو یا تجاہلِ عارفانہ نہ کرتا ہو) یہ کہہ دیگا کہ یہ فہرست میں اضافہ ہے۔ اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنی فہرست میں پھوپھیوں، خالاؤں بھانجیوں۔ رضاعی ماؤں اور بہنوں، بیویوں کی ماؤں اور بیٹوں کی بیویوں حتیٰ کہ پالی ہوئی لڑکیوں تک کا ذکر کر دیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ دو بہنوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کیا اللہ میاں کو (معاذ اللہ) یہ کہنا نہیں آتا تھا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ یا کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ سے اس بات میں سہو ہو گیا تھا اور یہ بات کہنے سے رہ گئی تھی جو اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلافی فرما دی۔ اور یوں خدا کی مرتب کردہ فہرست مکمل ہو گئی۔

آپ لوگوں کی بلا سے کہ اس قسم کے خیالات سے خدا، اس کی کتاب اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔

آپ کہہ دیں گے کہ یہ اضافہ رسول اللہ نے اپنی طرف سے نہیں فرمایا بلکہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی کی بنا پر فرمایا تھا۔ لیکن اس سے وہ سوال تو اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں محرمات کی فہرست دے رہا تھا تو کیا اس وقت (معاذ اللہ) اس کے سامنے یہ بات نہیں تھی جو بعد میں اس کا اضافہ کیا؟ اور پھر وہ بھی اس وحی کے ذریعے جو قرآن میں داخل نہ ہوئی۔ کیا قرآن کریم میں کہیں بھی یہ آیا ہے کہ اس میں بیان کردہ فہرستیں نا تمام ہیں اور ان کی تکمیل خدا نے ایک اور وحی سے کی ہے۔ جو قرآن میں درج نہیں ہوئی؟ (اور جسے نہ اس کے رسول نے کسی اور کتاب میں درج کیا ہے، اور اسے ڈھائی سو سال بعد بخارا کے ایک امام اپنے مجموعے میں درج کریں گے اور اس مجموعے کے متعلق چودہ سو سال بعد سلسلہ مودودیہ چشتیہ کے ایک صحافی یہ فتویٰ دیں گے کہ اس کی ہر حدیث اس قابل نہیں کہ اسے جوں کا توں مان لیا جائے۔ خدا کے بندو۔ کچھ تو اللہ میاں سے شرم کرو کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم اس کے آخری دین کو یوں اٹھو کہ بنا رہے ہو۔[۵۱]

[۵۱] اس ساری تقریر کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شارحِ قرآن بھی تھے اور خدا کے مقرر کردہ شارع بھی۔ ان کا منصب یہ بھی تھا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (لوگوں کے لیے خدا کے نازل کردہ احکام کی تشریح کریں) اور یہ بھی کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (پاک چیزیں لوگوں کے لیے حلال کریں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کر دیں)۔ اس لیے حضورؐ جس طرح قرآن کے قانون کی تشریح کرنے کے مجاز تھے اور آپ کی تشریح سند و حجت تھی، اسی طرح آپ تشریع کے بھی مجاز تھے اور آپ کی تشریع سند و حجت تھی۔ ان دونوں باتوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔ رہا پھوپھی اور خالہ کا معاملہ، تو ڈاکٹر صاحب اگر کج بحثی کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکتی تھی کہ قرآن نے جب ایک عورت کو اس کی بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا تو اس سے مقصود محبت کے اُس تعلق کی حفاظت کرنا تھا جو بہن اور بہن کے درمیان فطرۃً ہوتا ہے اور عملاً ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہی علّتِ حکم باپ کی بہن اور ماں کی بہن کے معاملے میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا پھوپھی اور بھتیجی کو، اور خالہ اور بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ خواہ تشریح و تعبیر ہو، یا استنباط، یا تشریع، بہرحال خدا کے رسولؐ کا حکم ہے اور آغازِ اسلام سے آج تک تمام امت نے بالاتفاق اسے قانون تسلیم کیا ہے۔ خوارج کے ایک فرقے کے سوا کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور اس فرقے کا استدلال بعینہٖ وہی تھا جو منکرینِ حدیث کا ہے کہ یہ حکم چونکہ قرآن میں نہیں ہے لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔ دوسری بحثیں جو ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اٹھائی ہیں وہ سب قلّتِ علم اور قلّتِ فہم کا نتیجہ ہیں۔ شریعت کے اہم اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک معاملہ میں جو چیز علّتِ حکم ہو وہی اگر کسی دوسرے معاملہ میں پائی جائے تو اس پر بھی وہی حکم جاری ہوگا۔ مثلاً قرآن میں صرف شراب (خمر) کو حرام کیا گیا تھا۔ حضورؐ نے بتایا کہ اس میں علّتِ حکم اس کا نشہ آور ہونا ہے، اس لیے ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اب صرف ایک کم علم اور نادان آدمی ہی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہی تھا تو کیا قرآن میں بھنگ، چرس، افیون اور تمام مُسکِرات کی فہرست نہیں دی جا سکتی تھی؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟ ۲۳۔ میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے جس طرح فقہی اصطلاحوں کی آڑ میں ہاں یا نہ کرنے سے گریز کیا ہے وہ بھی آپ کا ایک مخصوص حربہ ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ آپ منسوخ کے معنی نہیں سمجھتے تھے .... آپ نے خود اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کی فلاں آیت نے اس کی فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ....

نہ ہی میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ فقہا نسخ سے کیا مراد لیتے ہیں؟ سوال صاف تھا لیکن اس کا جواب دینے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آتی تھی [۱] (اور یہ دشواری آپ کو قدم قدم پر پیش آتی رہتی ہے)۔ اگر آپ یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کرتی تو آپ کو خطرہ تھا کہ اس سے وہ تمام حلقے ناراض ہو جائیں گے جو حدیث کو قرآن کا ناسخ جانتے ہیں۔ اور اگر یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے تو اس سے وہ طبقہ ناراض ہو جاتا جو یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کو کوئی چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس لیے دونوں طبقوں کو مطمئن رکھنے کا طریق یہ تھا کہ بات کو الجھا دیا جائے۔ جب اتنے سے ہتھکنڈے سے بات ٹل سکتی ہو تو کوئی سمجھدار تاجر اپنے گاہکوں کو خواہ مخواہ ناراض نہیں کیا کرتا۔

کیا قرآن کے علاوہ بھی حضور پر وحی آتی تھی؟ ۲۴۔ اب آتی ہے وہ آخری بات جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ساری بحث کا مدار اس پر ہے اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ساری کی ساری قرآن کریم میں درج ہو گئی ہے یا قرآن میں صرف وحی کا ایک حصہ داخل ہوا ہے۔ اور دوسرا حصہ درج نہیں ہوا۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ وحی کی دو (بلکہ کئی) قسمیں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم کی وحی قرآن میں درج ہوتی ہے۔ باقی اقسام کی وحییں قرآن میں درج نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان پر بھی اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے۔

---

[۱] اسی کتاب کے صفحہ ۵۴-۵۶ پر وہ بحث نکال کر پھر ایک دفعہ دیکھ لیجیے کہ اس پر ڈاکٹر صاحب کی یہ نکتہ زنی کس درجہ موزوں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح قرآن پر . . . . . . اگرچہ اس کا فیصلہ ایک مزاج شناس نبوت کی جوہرانہ (؟) نگاہ کرسکے گی کہ وہ وحی کہاں ہے[59] . . . . . .

مجھے اس کا اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ آپ قرآن کریم سے کس طرح نابلد ہیں۔ لیکن اس سوال کے جواب میں آپ نے جس طرح قرآن کا جھٹکا کیا ہے اس سے آپ کی "جرأت" ضرور قابل داد نظر آتی ہے۔ قبل اس کے کہ میں قرآن کریم کے ان مقامات کی طرف آؤں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ نے تفہیمات جلد اول میں یہ لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے۔ مگر یہ قانون ہمارے پاس بلا واسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسولِ خدا کے واسطے سے بھیجا گیا ہے۔ اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کرکے ایک نمونہ پیش کر دیں۔ اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لیے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیے[60]" (صفحہ ۲۳۷)

بصیرت رسولؐ کے خداداد ہونے کا صحیح مفہوم وحی کی خصوصیت یہ ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر وہ منزل من اللہ کہلاتی ہے کہ اس میں اس فرد کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا جس پر وہ وحی بھیجی جاتی ہے جس "وحی" کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصولی قانون کے عملی طریقے متعین فرماتے تھے اگر وہ واقعی وحی منزل من اللہ تھی تو اس میں حضورؐ کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر انہیں حضورؐ نے اپنی بصیرت سے تجویز فرمایا تھا

---

[59] ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ میری اُس بحث پر ہے جو اسی کتاب کے صفحات ۹۹-۱۰۵ پر کی گئی ہے۔ اصل بحث اور اس تبصرے کا مقابلہ کرکے ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے۔

[60] اس کے بعد کا فقرہ جسے ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے، یہ ہے:

"پس قرآن کی رُو سے نبی اکرمؐ اللہ کا بھیجا ہوا اصولی قانون پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو وہ وحی نہیں تھی۔ رسول کی اپنی بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو وہ خدا کی وحی نہیں ہو سکتی۔[۶۱] ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ میں نے "خداداد بصیرت" کہا ہے۔ اور انسانی بصیرت اور خداداد بصیرت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یہ جواب ہے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو جو بصیرت ملی ہے وہ خداداد ہے، یا کسی اور کی عطا کردہ؟ ہر انسانی بصیرت خداداد ہی ہوتی ہے؟[۶۲]

خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ ۔ ۔ (النساء۔ رکوع ۸)

[۶۱] یہاں ڈاکٹر صاحب نے لفظ وحی کے معنی سمجھنے میں پھر وہی غلطی کی ہے جس پر میں نے اپنے آخری خط میں ان کو متنبہ کر دیا تھا (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۲۰)۔ یہ منکرین حدیث کے بے نظیر اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف ہے کہ آپ ان کی ایک غلطی کو دس مرتبہ بھی مدلل طریقے سے غلط ثابت کر دیں، پھر بھی وہ اپنی بات دُہراتے چلے جائیں گے اور آپ کی بات کا قطعاً کوئی نوٹس نہ لیں گے۔

[۶۲] "خداداد بصیرت" سے میری مراد کوئی پیدائشی وصف نہیں ہے جس طرح ہر شخص کو کوئی نہ کوئی پیدائشی وصف ملا کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ وہبی بصیرت ہے جو نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرائضِ نبوت ادا کرنے کے لیے حضورؐ کو عطا فرمائی تھی، جس کی بنا پر حضورؐ قرآن کے مقاصد کی اُن گہرائیوں تک پہنچتے تھے جن تک کوئی غیر نبی نہیں پہنچ سکتا، جس کی روشنی میں آپ اسلام کی راہِ راست پر خود چلتے تھے اور دوسروں کے لیے نشاناتِ راہ واضح کر دیتے تھے۔ یہ بصیرت لازمۂ نبوت تھی جو کتاب کے ساتھ ساتھ حضورؐ کو عطا کی گئی تھی تاکہ آپ کتاب کا اصل منشا بھی بتائیں اور معاملاتِ زندگی میں لوگوں کی رہنمائی بھی کریں۔ اس بصیرت سے غیر انبیاء کی بصیرت کو آخر کیا نسبت ہے؟ غیر نبی کو جو بصیرت بھی اللہ سے ملتی ہے، خواہ وہ قانونی بصیرت ہو یا طبی بصیرت یا کاریگری و صناعی اور دوسرے علوم و فنون کی بصیرت، وہ اپنی نوعیت میں اُس نورِ علم و حکمت اور اُس کمالِ فہم و ادراک سے بالکل مختلف ہے جو نبی کو کارِ نبوت انجام دینے کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔ پہلی چیز خواہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحی کی اقسام از روئے قرآن | ۲۵ - آپ نے وحی خداوندی کی مختلف اقسام کے ثبوت میں سورہ الشوریٰ کی آیت ۵۱ پیش فرمائی ہے۔ اس کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے :

"کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔"

اول تو آپ نے (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) اس آیت کے آخری حصے کے معنی ہی نہیں سمجھے - میں اس آیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ صرف انبیائے کرام سے ہمکلام ہونے کے طریقوں کے متعلق بیان نہیں کر رہا بلکہ اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ اس کا ہر بشر کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حضرات انبیائے کرام اور دوسرے غیر نبی انسان۔ اس آیت کے پہلے دو حصوں میں حضرات انبیائے کرام سے کلام کرنے کے دو طریقوں کا ذکر ہے۔ ایک طریقے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مطلب ہے قلب نبوی پر وحی کا نزول جو حضرت جبریل کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اور دوسرا طریقہ تھا براہ راست خدا کی آواز جو پردے

کتنی ہی اونچے درجے کی ہو، بہر حال کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں ہے۔ کیونکہ اس بصیرت کے ذریعہ سے ایک غیر نبی جن نتائج پر بھی پہنچتا ہے ان کے متعلق وہ قطعاً نہیں جانتا کہ یہ نتائج وہ خدا کی رہنمائی سے اخذ کر رہا ہے یا اپنی ذاتی فکر سے۔ اس کے برعکس دوسری چیز اُسی طرح یقینی ذریعۂ علم ہے جس طرح نبی پر نازل ہونے والی کتاب یقینی ذریعۂ علم ہے۔ اس لیے کہ نبی کو پورے شعور کے ساتھ یہ علم ہوتا ہے کہ یہ رہنمائی خدا کی طرف سے ہو رہی ہے۔ لیکن منکرینِ حدیث کو نبی کی ذات سے جو بغض و عناد ہے اس کی وجہ سے نبی کے ہر فضل و شرف کا ذکر انہیں سیخ پا کر دیتا ہے اور وہ یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ نبی میں اور عام دانشمند انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ میاں نے اپنی ڈاک بندوں تک پہنچانے کے لیے اس کو نامہ بر مقرر کر دیا تھا :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پیچھے سے سنائی دیتی تھی۔ اور اس کا خصوصی ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں وضاحت سے ہے کہ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوسٰی تَکْلِیْمًا (۴/۱۶۴) اور دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ جو ذات مجھ سے یوں پس پردہ کلام کرتی ہے میں اسے بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس حصے کا یہ مفہوم لینا کہ انبیائے کرام کو خوابوں کے ذریعے وحی ملا کرتی تھی کسی طرح بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ آیت کے تیسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے خدا کا بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجتا ہے۔ اس رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم جب قرآن کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے[۶۳]

---

[۶۳] ڈاکٹر صاحب نے اپنی "قرآنی بصیرت" کا جو نمونہ یہاں پیش فرمایا ہے اس کا طول و عرض معلوم کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید میں سورۂ شوریٰ کا پانچواں رکوع نکال کر دیکھ لیجیے۔ جس آیت کے یہ معنی ڈاکٹر صاحب بیان فرما رہے ہیں ٹھیک اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (آیت ۵۲)

اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے وحی کی تمہاری طرف اپنے فرمان کی روح، تم کو پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے، مگر ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم رہنمائی کرتے ہیں جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے، اور یقیناً تم رہنمائی کرتے ہو راہ راست کی طرف۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کا کوئی حصہ بھی عام انسانوں تک خدا کی باتیں پہنچنے کی صورت بیان نہیں کر رہا ہے بلکہ اس میں صرف وہ طریقے بتائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ... اس میں ذکر کیا گیا ہے انہی کی طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تمہیدی گفتگو کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں | وحی غیر متلو پر ایمان، ایمان بالرسول کا جزء ہے
کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجنے کے مختلف طریقے بتاتے ہیں۔ وحی کی مختلف اقسام

اس آیت میں وَكَذَٰلِكَ (اور اسی طرح) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ انہی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرمان کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔

روحًا من امرنا سے مراد جبریل امین نہیں لیے جا سکتے۔ کیونکہ اگر وہ مراد ہوتے تو اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ کہنے کے بجائے اَرْسَلْنَا اِلَيْكَ فرمایا جاتا۔ اس لیے "فرمان کی روح" سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تینوں طریقوں سے حضور پر وحی کی گئیں۔ پھر آخری دو فقروں میں واقعات کی ترتیب یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کی رہنمائی اُس نور سے کر دی جو "روحِ فرمان" کی شکل میں اس کے پاس بھیجا گیا، اور اب وہ بندہ صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تاہم اگر سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے صرف اُسی ایک آیت پر نگاہ مرکوز کر لی جائے جس کی تفسیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں تب بھی اس کا وہ مطلب نہیں نکلتا جو انہوں نے اُس سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آیت کے تیسرے حصے کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی طرف رسول بھیجتا ہے، رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ "یا بھیجے ایک پیغامبر پھر وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو وہ چاہے"۔ اِس فقرے میں اگر "رسول" سے مراد بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول عام انسانوں پر وحی کرے۔ کیا واقعی عام انسانوں پر انبیاء علیہم السلام وحی کیا کرتے تھے؟ وحی کے تو معنی ہی اشارۂ لطیف اور کلامِ خفی کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو ازروئے لغت اُس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام خلقِ خدا کے درمیان علانیہ کرتے تھے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اسے اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اُس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو انبیاء کے پاس وحی لاتا تھا۔ اسی کی پیغام بری کو "وحی کرنے" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں بتائیں۔ جو وحی انبیاء کرام کو ملتی تھی اس کی مختلف قسموں کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی قرآن میں کہیں یہ ذکر آیا ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحی کا مجموعہ ہے۔ اور باقی اقسام کی وحییں جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں وہ کہیں اور درج ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خود قرآن کریم میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ اُوحی الیّ ھٰذا القرآن (سورۂ انعام۔ آیت ۱۹) "میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا"۔ کیا قرآن میں کسی ایک جگہ بھی درج ہے کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا اور اس کے علاوہ اور وحی بھی ملی ہے جو اس میں درج نہیں[۶۲]۔ اصل یہ ہے کہ آپ وحی کی اہمیت کو سمجھے ہی نہیں۔ وحی پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن ہو سکتا ہے اور یہ ایمان تمام و کمال وحی پر ایمان لانا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وحی کے ایک حصے پر ایمان لایا جائے اور دوسرے حصے پر ایمان نہ لایا جائے . . . . .

ایک حصے سے انکار تو ایک طرف۔ وحی کے ایک لفظ کے انکار پر بھی کفر لازم آجاتا ہے۔ آپ سوچیے کہ جس خدا نے وحی پر اس انداز سے ایمان لانے پر انسانوں کو مکلف ٹھہرایا ہو کیا اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس امر کی تصریح کر دے کہ وہ وحی کیا ہے؟ اور وہ تمہیں کہاں ملے گی؟ وحی کے ایک حصے کا اس صراحت سے ذکر کرنا اور دوسرے حصے کے متعلق بالصراحت قرآن میں کچھ نہ کہنا اور پھر اس پر ایمان نہ لانے سے انسان کا کافر قرار دینا۔ ع

می نہ سزد خدائے را

یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق آپ کا اپنا ارشاد ہے:

"یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانوں کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا، بلکہ پوری صراحت اور وضاحت سے ان کو کھول دیا گیا ہے

---

[۶۲] اس کا ثبوت اسی مراسلت کے پہلے خط میں دیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۹۹، ۱۰۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی" (رسائل و مسائل صفحہ ۱۶۷)

کیا کسی جگہ بھی قرآن میں "پوری صراحت اور وضاحت سے" یہ کہا گیا ہے کہ وحی قرآن کے علاوہ کہیں اور بھی ہے؟ آپ نے خارج از قرآن وحی کے ثبوت میں جو آیات پیش کی ہیں (اور جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا) ان میں بھی یہ چیز کہیں صراحت سے درج نہیں۔ آپ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان سے اشارۃً یہ چیز ظاہر ہوتی ہے ...... اور جیسا کہ آپ کے اقتباس سے واضح ہے اس کا اشارۃً ذکر وحی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے بصراحت و وضاحت یہ کہلوایا ہے کہ میری طرف یہ قرآن وحی ہوا ہے۔ اور جہاں بحضور رب العزت حضورؐ کی ایک شکایت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا[۶۵] (۲۵/۳۰)

---

[۶۵] اس ساری بحث کا جواب یہ ہے کہ وحی غیر متلو پر ایمان دراصل ایمان بالرسول کا ایک لازمی جزء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے علاوہ اپنے رسول پر ایمان لانے کا جو حکم دیا ہے وہ خود اس بات کا مقتضی ہے کہ رسول جو ہدایت و تعلیم بھی دیں اس پر ایمان لایا جائے، کیونکہ وہ من جانب اللہ ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی" (النساء۔۸۰)۔ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا "اگر تم اس کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے" (النور۔۵۴)۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ "یہ انبیاء وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے پس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو" (الانعام۔۹۰)۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ متعدد انبیاء ایسے گزرے ہیں جن پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔ کتاب تو کبھی نبی کے بغیر نہیں آئی ہے لیکن نبی کتاب کے بغیر بھی آتے رہے ہیں اور لوگ ان کی تعلیم و ہدایت پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح کتاب اللہ پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ خود کتاب لانے والے انبیاء پر بھی اول روز ہی سے وحی کتاب اللہ کی صورت میں نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا وحی غیر متلو بھی جبریل ہی لاتے تھے؟

۲۶- آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں صرف وہی وحی درج ہے جو حضرت جبریلؑ کی وساطت سے حضورؐ پر نازل ہوتی تھی۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کو

توراۃ کا نزول اُس وقت شروع ہوا جب وہ فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل کو لیکر طور کے دامن میں پہنچے (ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۶ و ۱۷ و سورۂ قصص آیات ۴۰-۴۳)۔ زمانۂ قیامِ مصر میں ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فرعون اور مصر کا ہر باشندہ اُن باتوں پر ایمان لانے کے لیے مامور تھا جنہیں وہ اللہ کی طرف سے پیش کرتے تھے، حتیٰ کہ انہی پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے وہ اپنے لشکروں سمیت مستحق عذاب ہوا۔ منکرین حدیث کو اگر اس چیز کے ماننے سے انکار ہے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن کی موجودہ ترتیب کے من جانب اللہ ہونے پر آپ ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ قرآن میں خود اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ یہ کتابِ پاک بیک وقت ایک مرتب کتاب کی شکل میں نازل نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے مختلف اوقات میں تدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے (بنی اسرائیل آیت ۱۰۶- الفرقان- آیت ۳۲)۔ دوسری طرف قرآن ہی میں یہ صراحت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مرتب کر کے پڑھوا دینے کا ذمہ خود لیا تھا۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ (القیامہ- ۱۷، ۱۸)۔ اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ہوئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی مرضی سے خود مرتب نہیں کر لیا ہے۔ اب کیا کسی شخص کو قرآن میں کہیں یہ حکم ملتا ہے کہ اُس کی سورتوں کو اس ترتیب کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی متفرق آیتوں کو کہاں کس سیاق و سباق میں رکھا جائے؟ اگر قرآن میں اس طرح کی کوئی ہدایت نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو لامحالہ پھر ماننا پڑے گا کہ قرآن ہدایات ہی حضورؐ کو اللہ تعالیٰ سے ملی ہوں گی جن کے تحت آپ نے یہ کتابِ پاک اس ترتیب سے خود پڑھی اور صحابہ کرام کو پڑھوائی۔ مزید براں اسی سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" پھر اس کا مطلب سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے" (آیت ۱۹)۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام و تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر حضورؐ اپنے قول و عمل سے کرتے تھے وہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کی طرف کوئی وحی حضرت جبریل کی وساطت کے بغیر بھی آتی تھی[٦٦]؟ دوسرے غالباً آپ کو اس کا علم نہیں کہ جس وحی کو آپ جبریل کی وساطت کے بغیر وحی کہتے ہیں (یعنی حدیث) اس کے متعلق حدیث کو وحی ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسے بھی جبریل لے کر اسی طرح نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کو لے کر ہوتے تھے (ملاحظہ فرمایئے جامع بیان العلم[٦٧]) اس لیے آپ کا یہ بیان خود آپ کے گروہ کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں۔ سوچیے کہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں کہ جن کا نہ تو قرآن سے ثبوت ملتا ہے اور نہ آپ کے اسلاف ہی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یاد رکھیے تنکوں کے پُل بنا کر ان پر سے ہاتھی گزارنے کی کوشش لایعنی ہوتی ہے۔

کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ

۲۷- آپ نے یہ دلیل دی ہے کہ خدا نے "کتاب وحکمت" دونوں کو منزل من اللہ کہا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد

نہ تھی بلکہ جو ذات پاک آپ پر قرآن نازل کرتی تھی وہی آپ کو اس کا مطلب بھی سمجھاتی تھی اور اس کے وضاحت طلب امور کی وضاحت بھی کرتی تھی۔ اسے ماننے سے کوئی ایسا شخص انکار کیسے کر سکتا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔

[٦٦] یہ عجیب مرض ہے کہ جس بات کا ماخذ بار بار بتایا جا چکا ہے اسی کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ سورۃ شوریٰ کی جس آیت پر ابھی ڈاکٹر صاحب خود بحث کر آئے ہیں اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے۔

[٦٧] معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جامع بیان العلم کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے اور یونہی کہیں سے اس کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں تو حسان بن عطیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبریل بالسنۃ التی تفسر ذالک [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی اور جبریل آ کر اس کی توضیح کرتے اور اس پر عمل کا طریقہ بتاتے تھے۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلا کہ ہر وحی جبریل ہی لاتے تھے؟ اس سے تو صرف یہ بات نکلتی ہے کہ جبریل

© rasailojaraid.com

سنت یا حدیث۔ آپ کی اس قرآن دانی پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ بندہ نواز۔ کتاب و حکمت میں واؤ عطف کی نہیں (جس کے معنی "اور" ہوتے ہیں) یہ واؤ تفسیری ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو خود حکیم (حکمت والا) کہا ہے۔ یٰس والقرآن الحکیم۔ دوسری جگہ الکتٰب کو الحکیم کہا ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۲/۳۱) کہیں اسے صرف کتاب کہا ہے۔ (۲۶/۱-۲) ذالک الکتٰب لاریب فیہ (۲/۲) اور کہیں صرف الحکمت جیسے ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ (۱۷/۳۹) لٰہذا کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے۔ "حکمت" کتاب کی تعریف و توصیف بیان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ان دونوں کا ذکر کرنے کے بعد ضمیر واحد کی لایا ہے۔ . . . . . وما انزل علیکم من الکتٰب والحکمۃ یعظکم بہ (۲/۲۳۱) قرآن کریم کی وہ آیات جنہیں میں نے اوپر درج کیا ہے اس کی دلالت کرتی ہیں کہ کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز ہے۔ اور اسی بنا پر میں نے ضمیر واحد کا ذکر کیا ہے ورنہ مجھے اس کا علم ہے کہ ضمیریں اور طرح بھی استعمال ہو جاتی ہیں[۵۸]۔

قرآن کے سوا دوسری وحیاں بھی لاتے تھے جن میں حضورؐ کو قرآن کے مطالب و معانی اور شرح و تفسیر سے آگاہ کیا جاتا تھا۔" جبریل بھی لاتے" اور "جبریل ہی لاتے" کا فرق سمجھنا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

۵۸؎ ڈاکٹر صاحب اس غلط فہمی میں ہیں کہ حرف واؤ کے معنی لینے میں آدمی کو پوری آزادی ہے، جہاں چاہے اسے عاطفہ قرار دے لے اور جہاں چاہے تفسیری کہہ دے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عربی زبان ہی میں نہیں کسی زبان کے ادب میں بھی الفاظ کے معنی متعین کرنے کا معاملہ اس طرح الل ٹپ نہیں ہے۔ واؤ کو تفسیری حرف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو، یا باہم مترادف المعنی ہوں، یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ قائل انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے۔ یہی اردو زبان میں لفظ "اور" کے استعمال کا طریقہ ہے کہ اسے تفسیری حرف اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب دو ہم معنی الفاظ کے درمیان آئے۔ جیسے کوئی شخص کہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان تمام دلائل سے بڑھ کر وہ دلیل ہے جو سورۂ احزاب کی اس آیت میں موجود ہے جسے آپ نے خود درج کیا ہے۔ اور جس کے متعلق آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ وہ آیت ہے واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ (۳۳/۳۵) آپکو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وحی کو جو قرآن میں درج ہے آپ وحی متلو اور خارج از قرآن وحی کو

"یہ جھوٹ اور افترا ہے" لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرنے کے لیے ہوگا، یا عام کو خاص پر، یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہوگا۔ ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔ اب دیکھیے کہ جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے اس کی رُو سے تو ظاہر ہی ہے کہ کتاب اور حکمت مترادف الفاظ نہیں ہیں بلکہ دونوں دو الگ معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ رہا قرآن، تو اس کے استعمالات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکمت کو وہ کتاب کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ اس نے کتاب بول کر کہیں حکمت مراد نہیں لی ہے اور حکمت بول کر کتاب مراد نہیں لی۔ کتاب کا لفظ جہاں بھی آیا ہے آیاتِ الٰہی کے مجموعہ کے لیے آیا ہے۔ اور حکمت کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اُس دانائی کے معنی میں آیا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے، کتاب کے باہر بھی ہو سکتی ہے اور کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ کتاب کے لیے جہاں "حکیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ تو ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے، مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور حکمت نازل ہونے کا یہ مطلب لینا درست نہیں ہوگا کہ حضور پر صرف کتاب نازل کی گئی، بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہونگے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشا ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں۔ اسی طرح یعلمھم الکتب والحکمۃ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اُس دانشمندی کی تعلیم و تربیت دیں جس سے لوگ دنیا کے نظام زندگی کو کتاب اللہ کے منشا کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحی غیر متلو قرار دیا کرتے ہیں۔ اس آیت میں حکمت کو بھی "ما یتلیٰ" کہا گیا ہے۔ لہٰذا حکمت سے مراد وحیٔ متلو ہے۔ وحی غیر متلو نہیں۔ دوسرے مقامات میں قرآن کو متلو کہا گیا ہے۔ . . . . . . مثلاً سورہ کہف میں ہے واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک (۱۸/۲۷)۔ دوسری جگہ ہے وامرت ان اکون . . . ان اتلوا القرآن (۹۲/۲۷) علاوہ ازیں قرآن کے متعدد مقامات میں یتلوا علیہم ایاتہ کے الفاظ آئے ہیں۔ احادیث کی تلاوت کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اس لیے سورۃ احزاب میں جس حکمت کی تلاوت کا ذکر ہے اس سے مراد قرآن ہی ہے [۶۹]

اگر محض اس واؤ کی وجہ سے کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں مراد لی جائیں تو کہیے کہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم کیا ہوگا جس میں کہا گیا ہے۔

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (۴۸/۲۸)

کیا اس میں بھی ہدایت اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں [۷۰]؟ اگر الگ الگ لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین میں (معاذاللہ) ہدایت نہیں اور ہدایت میں دین شامل نہیں۔ دین ایک جگہ ہے اور ہدایت دوسری جگہ ہے۔ اللہ امت کو آپ جیسے مفسروں کی گمراہی سے محفوظ

---

۶۹ ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ لفظ تلاوت کو ایک اصطلاح کے طور پر صرف "تلاوت کتاب اللہ" کے معنی میں مخصوص کرنا بعد کے اہل علم کا فعل ہے جس کی بنا پر "وحی متلو" اور "وحی غیر متلو" کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ قرآن میں تلاوت کا لفظ مجرد پڑھنے کے معنی میں آیا ہے۔ اصطلاح کے طور پر نہیں ہے۔ اگر اس میں کچھ شک ہو تو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۲ ملاحظہ فرمائیں وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ "اور انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جسے شیاطین تلاوت کیا کرتے تھے سلیمان کی بادشاہی کے دور میں"

۷۰ اس کا جواب حاشیہ نمبر ۶۸ میں گزر چکا ہے۔ ہدایت اور دین حق کا ہم معنی ہونا تو واضح ہے۔ ان کے درمیان واو کا استعمال جس معنی میں ہوا ہے اسے اس بات کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ کتاب اور حکمت کے درمیان بھی اس کے دہی معنی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھے۔ جو محض اپنی تفسیریں بیچنے کے لیے قرآن سے اس طرح مذاق کر رہے ہیں۔

۲۸۔ آپ کے بیان کے مطابق کتاب سے مراد ہوئی قرآن اور حکمت سے سنت رسول اللہ صلعم۔ جو آپ کے الفاظ میں حضورؐ کے اقوال اور افعال دونوں پر مشتمل ہے۔ (ترجمان دسمبر، صفحہ ۱۸۲)

کتاب کے ساتھ میزان کے نزول کا مطلب | اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

"پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا بھی ذکر کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے۔ (یعنی المیزان)

"اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان"۔ (الشوریٰ ۱۷)

(ایضاً صفحہ ۱۸۳)

اس میزان کی تشریح کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ:

"کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاء پر نازل کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص اپنے پاس سے وہ راہ نمائی کی صلاحیت عطا فرمائی جس سے انہوں نے کتاب اللہ کے منشاء کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا"۔ (ایضاً)

یعنی آپ کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل چیزیں منزل من اللہ ہوئیں۔

۱۔ کتاب یعنی قرآن حکیم۔

۲۔ حکمت۔ یعنی رسول اللہ کے اقوال و افعال۔ اور

۳۔ میزان۔ یعنی رہنمائی کی صلاحیت ؎

ظاہر ہے کہ یہ تیسری چیز نہ رسول اللہ کے اقوال میں شامل ہے نہ افعال میں۔ بالفاظ دیگر جس طرح رسول اللہ کے اقوال اور افعال قرآن سے الگ تھے اسی طرح حضورؐ کے اقوال و

؎ محض رہنمائی کی صلاحیت نہیں بلکہ وہ صلاحیت جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افعال اس آسمانی راہ نمائی سے بھی الگ تھے۔ جسے المیزان سے تعبیر کیا گیا ہے[۴۲]۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

حیرت ہے کہ آپ نے سورہ حدید کی آیت ۲۵ کا اتنا ہی حصہ کیوں نقل فرمایا۔ جس میں کتاب اور میزان کا ذکر ہے۔ اور اس ٹکڑے کا ذکر کیوں نہ کیا جس میں کہا گیا ہے وانزلنا الحدید (اور ہم نے لوہا بھی نازل کیا)، اس سے تو ظاہر ہے کہ کتاب اور میزان کے ساتھ چوتھی چیز الحدید بھی اسی طرح منزل من اللہ ہے[۴۳]۔

---

[۴۲] اگر یہ بحث محض برائے بحث نہ ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کے اقوال و افعال میں ہر معقول آدمی کو خدا کی عطا کردہ حکمت اور میزانِ عدل کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بحث پیدا کرنا کہ جب حکمت حضورؐ کے اقوال و افعال پر مشتمل تھی تو یہ میزان آپ کے اقوال و افعال سے باہر ہونی چاہیے، درحقیقت کج بحثی کی بدترین مثال ہے۔ ایک شخص کے اقوال و افعال میں بیک وقت دانشمندی بھی پائی جا سکتی ہے اور توازن بھی۔ کیا ان دونوں چیزوں میں کوئی ایسا تضاد ہے کہ ایک چیز موجود ہو تو دوسری اس کے ساتھ موجود نہ ہو سکے؟ انہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث کس درجہ کج فہم اور کج بحث واقع ہوئے ہیں۔

[۴۳] ڈاکٹر صاحب کو تو علمِ تفسیر میں بہت زیادہ کمال حاصل ہے، اس لیے ان سے کچھ کہنا تو لاحاصل ہے۔ لیکن ناظرین خود سورۃ حدید کی آیت ۲۵ کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ اس میں کتاب اور میزان کے متعلق تو فرمایا گیا ہے اَنْزَلْنَا مَعَهُمْ (ہم نے یہ دونوں چیزیں انبیاء کے ساتھ نازل کیں)، لیکن حدید کے متعلق صرف یہ فرمایا گیا کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (اور ہم نے لوہا اتارا)۔ اس لیے اس کا شمار ان چیزوں میں نہیں کیا جا سکتا جو خصوصیت کے ساتھ انبیاء کو دی گئی ہیں۔ "لوہا" تو عادل اور ظالم سب استعمال کرتے ہیں۔ یہ خصائصِ انبیاء میں سے نہیں ہے۔ البتہ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس طاقت کو کتاب اور میزان کا تابع رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ رہا لوہے کا منزل من اللہ ہونا۔ تو ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ بڑی عجیب بات ہے۔ مگر قرآن کے صا[illegible] اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ" ہم نے لوہا اتارا"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور کج بحثی | ۲۹ - منزّل من اللہ کی آپ کی یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی - آپ فرماتے ہیں :-

"پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی۔" (ایضاً صفحہ ۱۸۲)

اس کے لیے آپ نے حسبِ ذیل تین آیات درج فرمائی ہیں۔

"۱- فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا۔ (التغابن ۵)	پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔
۲- فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (الاعراف - ۱۵۷)	پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے - وہی فلاح پانے والے ہیں۔
۳- قد جاءکم من اللہ نورٌ وکتٰب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ (المائدہ ۱۵ - ۱۶)	تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتابِ مبین جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔"

پہلی آیت میں اللہ اور رسول اور النور پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ کیا آپ کے خیال کے مطابق اللہ اور رسول کے علاوہ ایمان لانے کا حکم نہ کتاب پر ہے نہ حکمت پر، نہ میزان پر بلکہ صرف چوتھی چیز پر جسے آپ کتاب و حکمت و میزان سے الگ قرار دیتے ہیں۔ دوسری آیت میں رسول اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور النور کے اتباع کا حکم یعنی اس میں کتاب اور حکمت کے اتباع کا حکم نہیں ہے۔ آپ کے استدلال کے مطابق اگر کوئی شخص قرآن پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمان نہیں لاتا۔ صرف النور پر ایمان لاتا ہے اور وہ قرآن کا اتباع بھی نہیں کرتا صرف النور کا اتباع کرتا ہے وہ مومنین اور مفلحین کے زمرے میں داخل ہو گا۔[1] یہ النور کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں آپ فرماتے ہیں:

"اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضور کو عطا فرمائی تھی۔" (ایضاً ص ۱۸۲)

چلو قرآن پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے سے تو چھٹی پائی، بلکہ حضورؐ کے اقوال و افعال کی اطاعت سے بھی۔ کیونکہ ان آیات میں صرف النور کا ذکر ہے۔ سچ ہے عقل کی تو کرنی

---

[1] یہ کج بحثی کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی سوچ سمجھ کر قرآن پڑھا ہوتا تو انہیں اس کتاب کے انداز بیان کا پتہ لگا ہوتا۔ قرآن مختلف مقامات پر موقع و محل کی مناسبت سے اپنی تعلیم کے مختلف اجزاء کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مثلاً کہیں وہ صرف ایمان باللہ کے نتیجے میں جنت کی بشارت دیتا ہے۔ کہیں صرف آخرت کے اقرار و انکار کو مدار فلاح و خسران بتاتا ہے۔ کہیں خدا اور یوم آخر پر ایمان کا ثمرہ یہ بتاتا ہے کہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون۔ کہیں صرف رسول پر ایمان لانے کو موجب فلاح ٹھیراتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی کبھی کسی چیز کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور کبھی کسی دوسری چیز کو۔ اب کیا یہ ساری آیات ایک دوسرے سے اسی طرح ٹکرائی جائیں گی اور ان سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے گا کہ ان میں تضاد ہے؟ حالانکہ ذرا سی عقل بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ان تمام مقامات پر قرآن نے ایک بڑی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو حسب موقع الگ الگ نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور ان پہلوؤں میں سے کوئی کسی دوسرے پہلو کی نفی نہیں کرتا۔ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے گا اور اس روشنی کے پیچھے چلنا قبول کرے گا جسے رسول پاک لائے ہیں وہ آپ سے آپ قرآن کو بھی مانے گا اور حضور کی سکھائی ہوئی حکمت و دانش سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کرے گا۔ قرآن کا انکار کرنے والے کے متعلق یہ تصور ہی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ نورِ رسالت کا متبع ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخری حد ہوتی ہے۔ لیکن جہالت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔[۵۵]

۳۰۔ آپ کی وجہ فرمودہ تیسری آیت میں نور و کتاب کا ذکر ہے۔ اس واؤ کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن آپ اس سے دو الگ الگ چیزیں مراد لیتے ہیں[۵۶] حالانکہ اس کے بعد ضمیر واحد کی ہے[۵۷]۔ یہدی بہ اللہ۔ اور اس کا ترجمہ بھی آپ نے واحد ہی کیا ہے، جب لکھا ہے کہ:

"تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔"

فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں نور کے ذریعے دکھاتا ہے یا کتاب کے ذریعے؟ اگر آپ کہیں کہ دونوں کے ذریعے، تو اس کی شہادت آپ کا ترجمہ نہیں دیتا۔ اگر یہ دونوں الگ الگ ہیں تو آپ کو لکھنا چاہیے تھا "تمہارے پاس آگئے ہیں نور اور کتابِ مبین جن کے ذریعے سے . . . . . .

ضمناً آپ نے اپنے ترجمہ میں منَ اللہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ اگر میں آپ کی تقلید میں یہ کہہ دوں کہ آپ کو اتنی سی عربی بھی نہیں آتی تو فرمایئے کہ آپ کا احساس کیا ہوگا؟ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ مجھے انا الموجود لاغیری کا دعویٰ نہیں ہے[۵۸]۔

---

[۵۵] اس کتاب کے صفحہ ۱۱۶-۱۱۷ پر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسے نکال کر ایک نظر پھر دیکھ لیجیے اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کو ملاحظہ کیجیے تاکہ جہالت کے حقیقی خدوخال آپ کے سامنے آجائیں۔

[۵۶] اس کا جواب حاشیہ نمبر ۶۸ میں گزر چکا ہے۔

[۵۷] ڈاکٹر صاحب خود پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ محض ضمیر واحد کے استعمال سے کوئی قوی استدلال نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ "ضمیریں اور طرح بھی استعمال ہو جاتی ہیں"۔

[۵۸] اس تنبیہ کا بہت شکریہ۔ مگر ترجمے میں کسی لفظ کا چھوٹ جانا اس نوعیت کی غلطی نہیں ہے جیسی ڈاکٹر صاحب نے آیات کو نقل کرنے میں کی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا حضرت، حکمت کی طرح نور بھی قرآن ہی کی صفت ہے۔ قرآن ہی وہ روشنی ہے جو ہر چیز کو واضح اور نمایاں کر دیتی ہے۔ لیکن اپنے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں پھر اسے روشنی کہنے سے یہ بھی مقصود تھا کہ اس سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آپ کی طرح آنکھیں بند رکھنے والوں کو نور کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

مکتب و ملا و اسرار کتاب   کور مادر زاد و نور آفتاب

۱۲۱۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے منزل من اللہ چیزوں کی فہرست میں کیا کیا اُٹھا رکھا ہے لیکن آپ نے تو اسے یہیں ختم کر دیا۔ قرآن نے ان کے علاوہ ذکر۔ روح۔ برہان۔ ہدیٰ وغیرہ کے منزل من اللہ یا وحی ہونے کا بھی تو ذکر کیا ہے[۹ ؎] ان کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیا ہوتا کہ ان سے قرآن کے علاوہ اور کیا مراد ہے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ "قرآن مجید میں جہاں نازل کرنے کے ساتھ کتاب یا ذکر یا فرقان کی تصریح کی گئی ہے صرف اسی جگہ ما انزل اللہ سے مراد قرآن ہے" (ایضاً صفحہ ۱۸۰)

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے پاس اس حصر کی دلیل کیا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ ان مقامات میں تو مراد قرآن ہے اور دوسرے مقامات میں مراد وحی خارج از قرآن ہے؟ کیا یہ تفریق آپ کے ذہنِ رسا کی پیداوار نہیں[؎] ؟ کیا اس قسم کی اختراعات پر آپ کو کچھ خدا کا خوف نہیں آتا کہ آپ خدا کی کتاب کو وہ معنی پہنا رہے

---

۹ ؎ اگر ڈاکٹر صاحب وہ آیات بھی نقل فرما دیتے جن میں ان چیزوں کے نازل کیے جانے کا ذکر ہے تو یہ بات خود ظاہر ہو جاتی کہ اس بحث سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

؎ یہ بات ان تمام آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پر نازل کی جانے والی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں کوئی صاف قرینہ اس منزل من اللہ چیز سے قرآن مراد ہونے کا ہے صرف اسی جگہ ما انزل اللہ کے الفاظ کا اطلاق قرآن پر ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں جو ــــ اقبال کے الفاظ میں ــــ "خدا، رسول اور جبریل کو بھی حیرت میں ڈال دیں۔"

۳۲۔ ان تصریحات کے بعد مجھے ان مقامات کی طرف آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جن سے آپ نے (قرآن سے جہالت کی بنا پر) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ یہ ان چیزوں کا ذکر کرتی ہے جو اس میں وضاحت سے مذکور نہیں۔ اور ان کے لیے ہمیں دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور وہ مقامات ہیں وحی خارج از قرآن۔ لیکن چونکہ آپ اس خط و کتابت کے پچھلے حصے کو میرے جواب کا انتظار کیے بغیر شائع کر چکے ہیں جس سے آپ کے سادہ لوح مریدوں کے اور گمراہ ہونے کا امکان ہے اس لیے میں ان کے متعلق بھی مختصراً عرض کیے دیتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض سعید روحیں اس گمراہی سے نکل سکیں۔ ورنہ آپ کے راہِ راست پر آنے کی تو کوئی امید نہیں۔ امارت اور قیادت کی جاذبیتیں انسان کو کبھی صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیا کرتیں۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

<u>تحویل قبلہ والی آیت میں کونسا قبلہ مراد ہے؟</u> ۳۳۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجیے جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ:

> "یہ ایسی ہزار دلیل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہؐ پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔" (ترجمان اکتوبر ۶۰ء ص ۴۹ [۱])

آپ نے وہ آیت اور اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے:

"وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول

---

[۱] یہ پوری بحث اس کتاب کے صفحات ۸۷-۹۹ اور ۱۰۱ پر موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کو پڑھتے وقت اس پر پھر ایک نظر ڈال لیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممن ینقلب علیٰ عقبیہ (۲/۱۴۳)" اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔"

اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ

"مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دے دیں" (ایضاً ص ۴۲۹)

اگر اس کے متعلق خدا کی طرف سے کوئی حکم آیا ہوتا تو ضرور قرآن میں ہوتا۔ لیکن جب حکم آیا ہی نہیں تھا تو میں اس کا حوالہ قرآن سے کیسے دوں؟ آپ نے پہلے یہ فرض کر لیا ہے کہ پہلے قبلے کو خدا نے مقرر کیا تھا اور اس کے بعد آپ اس آیت کا ترجمہ اسی مفروضہ کے مطابق کرتے ہیں۔ اس آیت میں کُنْتَ کے معنی "تو تھا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "تو ہے" یعنی "ہم نے وہ قبلہ جس پر تو ہے اس لیے مقرر کیا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ ان معانی کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے

٭ اس آیت میں کُنْتَ کے معنی "تو ہے" صرف اس بنیاد پر کر ڈالے گئے ہیں کہ عربی زبان میں کَانَ کبھی کبھی "تھا" کے بجائے "ہے" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جس شخص نے بھی سورۂ بقرہ کا وہ پورا رکوع کبھی سمجھ کر پڑھا ہو جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، وہ یہاں کُنْتَ کے معنی "تو ہے" ہرگز نہیں لے سکتا، کیونکہ مضمونِ ماسبق و مابعد یہ معنی لینے میں مانع ہے۔ رکوع کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے: سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا "نادان لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے پھیر دیا ان کو ان کے اُس قبلے سے جس پر یہ تھے"۔ یہاں کَانُوا کا ترجمہ "یہ ہیں" کسی طرح بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "کس چیز نے پھیر دیا" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پہلے مسلمان کسی اور قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے، اب اسے چھوڑ کر دوسرے قبلے کی طرف رُخ پھیرنے والے ہیں، اور اسی بنا پر مخالفین کی طرف سے اس اعتراض کا موقع پیدا ہو رہا ہے کہ یہ اپنے پہلے قبلے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ اگر تسلیم کیا جائے کہ پہلا قبلہ خدا نے مقرر کیا تھا تو اس ٹکڑے کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے کہ "ہم نے یہ اس لیے کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔" اس لیے کہ پہلے قبلہ کے تعین کے وقت کسی کا اُلٹے پاؤں پھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضور ایک قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے۔ جو

کیوں پھر گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اگر مخالفین یہ اعتراض کریں تو اس کا جواب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ فقرہ ارشاد فرمایا جاتا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا . . . " اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تم تھے نہیں مقرر کیا تھا مگر اس لیے کہ . . ." یہاں كُنْتَ عَلَيْهَا سے مراد بعینہ وہی چیز ہے جس کے متعلق اوپر کی آیت میں كَانُوا عَلَيْهَا فرمایا گیا ہے اس کے معنی "تو ہے" کسی طرح بھی نہیں لیے جا سکتے۔ سابقہ آیت قطعی طور پر اس کے معنی "تو تھا" متعین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد تیسری آیت میں تحویل قبلہ کا حکم اس طرح دیا جاتا ہے: قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا۔ پس ہم پھیرے دیتے ہیں تم کو اس قبلے کی طرف جسے تم چاہتے ہو، اب موڑ دو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔" ان الفاظ سے صاف نقشہ نگاہ کے سامنے یہ آتا ہے کہ پہلے مسجد حرام کے سوا کسی اور قبلے کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ اب وہ قبلہ بدل دیا جائے۔ اس لیے آپ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے تھے کہ کب تبدیلیٔ قبلہ کا حکم آتا ہے۔ اس حالت میں فرمان آگیا کہ لو اب ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم قبلہ بنانا چاہتے ہو۔ پھیر دو اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف۔ اس سیاق و سباق میں آیت وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا الخ، کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان الٹی سیدھی تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جو ڈاکٹر صاحب نے یہاں پیش فرمائی ہیں! اللہ تعالیٰ صاف فرما رہا ہے کہ مسجد حرام سے پہلے جو قبلہ تھا وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا اور ہم نے اسے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخص حضورؐ کے ساتھ شریک ہوتا تھا وہ بھی اسی طرف رُخ کر لیتا تھا۔ؔ "اُلٹے پاؤں پھرنے" کا سوال اس وقت پیدا ہوا جب اس قبلے میں تبدیلی کی گئی۔ اس وقت اس کے پرکھنے کا موقع آیا کہ کون اسی پہلے قبلے کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور کون رسول کے اتباع میں (جس نے بحکمِ خداوندی یہ تبدیلی کی ہے) نئے قبلے کی طرف رُخ کرتا ہے۔

نبیؐ پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام | یہ بات کہ اس نئے قبلے کا حکم ہی خدا کی طرف سے آیا تھا، پہلے قبلہ کا نہیں، وہی آیات بعد قرآن نے واضح کر دی جہاں کہا ہے کہ ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءك من العلم انك اذا لمن الظلمین (۲-۱۴۵)۔ یعنی "اگر تو علم آجانے کے بعد ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے گا تو تو اس وقت بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا۔"

ؔ یہ محض قلتِ فہم اور قلتِ علم کا کرشمہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مسجدِ حرام تمام اہلِ عرب کے لیے مقدس ترین تیرتھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسلام میں ابتداءً جب اس کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تو یہ عربوں کے لیے سخت آزمائش کا موقع تھا۔ ان کے لیے اپنے مرکزی معبد کو چھوڑ کر یہودیوں کے معبد کو قبلہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسی کی طرف آیتِ زیرِ بحث کا یہ فقرہ اشارہ کرتا ہے کہ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ۔ "اگرچہ وہ قبلہ سخت گراں تھا مگر اُن لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی تھی، اور اللہ تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔" ان الفاظ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس قبلے کے معاملہ میں اُلٹے پھر جانے کا سوال کیوں پیدا ہوتا تھا۔ مزید براں یہی الفاظ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ جو حکم قرآن میں نہیں آیا تھا بلکہ رسولِ پاکؐ کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا اسی کے ذریعہ سے لوگوں کے ایمان کی آزمائش کی گئی تھی۔ اس حکم کی پیروی جن لوگوں نے کی انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ کیا اب بھی اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ غیر از قرآن بھی رسول کے پاس کوئی حکم آتا ہے اور اس پر بھی ایمان کا مطالبہ ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے صاف واضح ہے کہ العلم (یعنی وحی خداوندی) نئے قبلے کے لیے آئی تھی۔ اگر پہلا قبلہ بھی العلم کے مطابق مقرر ہوتا تو یہاں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ "العلم" کے آنے کے بعد تم پہلے قبلے کی طرف رُخ نہ کرنا۔٭ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم جس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ وہ

٭ مجھے شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں مگر اب کیا اس کی شکایت کی جائے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اس قدر بے باک ہوں ان کے سامنے ماوشما کی کیا ہستی ہے۔ جس آیت کا آخری ٹکڑا نقل کر کے اس سے یہ مطلب نچوڑا جا رہا ہے وہ پوری آیت اور اس سے پہلے کی آیت کا آخری فقرہ ملا کر پڑھیے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ بیت المقدس کو چھوڑ کر جب مسجد حرام کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں کے لیے اسی طرح طعن و تشنیع کا موقع پیدا ہو گیا جس طرح قبلۂ سابق پر اہلِ عرب کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ، وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

(البقرہ ۱۴۴ - ۱۴۵)

اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ (یعنی مسجد حرام کو قبلہ بنانا) حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی ان اہلِ کتاب کے پاس لے آؤ یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے۔ اور تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہو۔ اور نہ ان میں سے کوئی کسی کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے۔ اور اگر تم نے وہ علم آجانے کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو تم ظالموں میں سے ہو گے۔

اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ پہلا قبلہ العلم کے

© rasailojaraid.com

ہر دعوے کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا کا مطلب ۲۴۔ دوسری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شآء اللہ امنین محلقین رؤسکم و مقصرین لا تخافون فعلم ما لم تعلموا فجعل من دون ذالک فتحاً قریبًا۔ اور اس کا ترجمہ کیا ہے "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا۔۔۔"؟

اوّل تو یہ فرمائیے کہ آپ نے صدق اللہ رسولہ الرؤیا کا ترجمہ "اللہ نے سچا خواب دکھایا" کس قاعدے کی رو سے کیا ہے صدق الرؤیا کے معنی "اس نے سچا خواب دکھایا" ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے معنی ہیں "خواب کو سچا کر دکھایا" جیسے لقد صدق اللہ وعدہ "اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا" آپ نے خود اس کا ترجمہ "پورا کر دیا" کیے ہیں۔ یہ نہیں کیے کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا ہے۵۵

مطابق مقرر نہیں کیا گیا تھا اور صرف یہ دوسرا قبلہ ہی اس کے مطابق مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب خدا کا حکم بیت المقدس کو چھوڑ کر مسجد حرام کو قبلہ بنانے کے لیے آگیا ہے تو اب اس العلم کے آجانے کے بعد محض یہودیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر سابق قبلے کی طرف رخ کرنا ظلم ہوگا۔ کسی منطق کی رو سے بھی اس کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کیا جاتا تھا وہ حضورؐ کا خود ساختہ تھا۔ خصوصاً جبکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں وہ کچھ تصریحات موجود ہوں جو حاشیہ نمبر ۴۲۔۸ میں ابھی ابھی نقل کی جا چکی ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام رکھنا ایک بدترین قسم کی جسارت ہے۔

۵۵ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا کے معنی "اللہ نے رسول کا خواب سچا کر دکھایا" کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ بات کہنی ہوتی تو صَدَقَ اللّٰہُ رُؤْیَا الرَّسُوْلِ کہا جاتا نہ کہ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا۔ اس فقرے میں صَدَقَ کے دو مفعول ہیں۔ ایک رسول جسے خواب دکھایا گیا۔ دوسرا خواب جو سچا تھا، یا جس میں سچی بات بتائی گئی تھی اس لیے لامحالہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے اپنے ترجمہ کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ کا یہ خواب بھی از قبیل وحی تھا۔ خواب کو وحی قرار دینا وحی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ آپ حضرات کے یہی اعتقادات ہیں جن سے مرزا غلام احمد صاحب کو دعوائے نبوت کی جرأت ہو

اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا، یا اس کو خواب میں سچی بات بتائی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عربی میں کوئی کہے صَدَقَنِی الْحَدِیْثَ۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس نے مجھ سے سچی بات کہی۔ نہ یہ کہ اس نے جو بات مجھ سے کہی اسے سچا کر دکھایا۔ مزید برآں اگر اس فقرے کے وہ معنی لے بھی لیے جائیں جو ڈاکٹر صاحب لینا چاہتے ہیں تو اس کے بعد والا فقرہ قطعاً بے معنی ہو جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ "تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے"۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خواب میں جو بات دکھائی گئی تھی وہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، اُس کی سچائی ثابت ہونے سے پہلے جن لوگوں کو رسول کے خواب کی صداقت میں شبہ پیدا ہوا ہے ان کو اللہ تعالیٰ یقین دلا رہا ہے کہ ہم نے سچا خواب دکھایا ہے۔ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔ اگر ان آیات کے نزول سے پہلے وہ خواب سچا کر دکھایا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لَتَدْخُلُنَّ (تم ضرور داخل ہو گے) کہنے کے بجائے قَدْ دَخَلْتُمْ (تم داخل ہو چکے ہو) فرماتا۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ پوری سورۂ فتح جس کی ایک آیت پر یہاں کلام کیا جا رہا ہے، اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مسلمان عمرے سے روک دیئے گئے تھے اور مسجد حرام میں داخل ہونے کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اس سیاق و سباق میں اس آیت کا یہ مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا کہ اس وقت خواب پورا ہو چکا تھا۔

تشہ اس کا جواب اِسی کتاب کے صفحہ ۱۲۱ پر موجود ہے۔ مزید برآں سورۂ صافات کی آیات ۱۰۲-۱۰۵ ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کی قطعی تردید کر دیتی ہیں۔ حضرت ابراہیم اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ "بیٹا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں"۔ صاحبزادے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ یٰاَبَتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئی۔ وہ بھی اپنے خوابوں کو الہامی قرار دیتے تھے۔ اور جب وہ جھوٹے ثابت ہوتے تھے تو وہ کہہ دیا کرتے تھے کہ خود رسول اللہ نے جو خواب دیکھا تھا انہوں نے بھی اسے (معاذ اللہ) غلط سمجھا تھا۔ اور ان کا یہ جواب بھی آپ ہی کے باطل عقیدے کا نتیجہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابہ کرام کو دیتے ہیں اور پھر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہو جاتی ہے بعض صحابہ اس سے خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا (کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ایسا ہوگا؟" (ترجمان۔ نومبر ص ۱۱)

آپ نے اس اعتراض سے بچنے کے لیے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو اپنی وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔ یہ اختراع فرمائی ہے کہ "حضورؐ کو خواب کے ذریعہ مکہ میں داخل

افعل ما تؤمر" ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے۔" اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ صاحبزادے نے اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھا بلکہ اللہ کا حکم سمجھا جو خواب میں دیا گیا تھا۔ اگر صاحبزادے نے یہ بات غلط سمجھی تھی تو اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرما دیتا کہ ہم پیغمبروں کو خواب میں احکام نہیں دیا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا ابراہیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین۔ "اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا، ہم محسنوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔"

ـــ معلوم نہیں یہ اعتراض کس جگہ سے پیدا ہو گیا کہ "خود حضورؐ کو وحی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔ جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے اوپر نقل کی ہے اس سے تو صرف یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضورؐ کا خواب سن کر لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ اسی سفر میں عمرہ ہوگا۔ اور جب وہ نہ ہو سکا تو لوگ خلجان میں پڑ گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں۔ کفار روکیں گے۔ آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا دروازہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے وحی ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟ (ایضاً)

آپ نے اپنی طرف سے تو بڑا تیر مارا کہ اس اختراع سے آپ اس اعتراض سے بچ گئے لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے خود نبی اکرم کی ذات اقدس و اعظم کے خلاف کتنا بڑا طعن پڑتا ہے۔ آپ کو اس سے کیا غرض، طعن پڑتا ہے تو پڑا کرے آپ نے تو (بزعم خویش) میدان مار لیا۔

جو واقعہ آپ نے شروع سے آخر تک لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ

۱۔ رسول اللہ کو شروع ہی سے اللہ کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ اس سال روکے جائیں گے اور اگلے سال مکہ میں داخلہ ہو گا۔

۲۔ رسول اللہ نے اس کی اطلاع صحابہؓ میں سے کسی کو نہ دی بلکہ انہیں یہ تاثر دیا کہ مکہ میں داخلہ اسی سفر میں ہو گا۔* جبھی تو صحابہؓ خلجان میں پڑ گئے۔ اور حضرت عمرؓ جیسے قریبی صحابی کو یہ کہنا پڑا کہ آپ نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے۔ اور طواف کریں گے۔ پھر یہ کیا ہوا؟

ذرا سوچیے کہ اس سے رسول اللہ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے آپ کو ایک بات کی خبر دیتا ہے۔ اور آپ صحابہؓ سے پوری بات (معاذ اللہ) چھپا کر رکھتے ہیں۔ اور انہیں (توبہ توبہ) غلط تاثر دے کر ساتھ لے چلتے ہیں۔

---

* یہ بات کہاں سے نکل آئی کہ حضورؐ نے یہ تاثر دیا تھا؟ یہ تو بعض لوگوں نے بطور خود سمجھ لیا تھا کہ عمرہ اسی سال ہو جائے گا۔ اوپر میری جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے خود نقل کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ "کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے" تو حضورؐ نے ان کو جواب دیا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہو گا"۔ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ نے واقعی لوگوں کو خود یہ تاثر دیا ہوتا کہ اسی سفر میں عمرہ ہو گا تو حضورؐ ان کے جواب میں یہ بات کیسے فرما سکتے تھے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب راستہ رک جاتا ہے تو اس وقت بھی یہ نہیں فرماتے کہ مجھے اللہ نے ان باتوں کا پہلے علم دے دیا تھا۔ داخلہ ہمارا اگلے سال ہونا تھا۔ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ اس سال داخلہ ہوگا"[۹۸] اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو ہدایت دے۔ کیا آپ کو حضور کی ذاتِ گرامی کا بھی کچھ پاس نہیں؟

دروغ گویم بروئے تو[،] لیکن آپکو کیا پاس ہو سکتا ہے۔ آپ تو اپنے جھوٹوں کے جواز میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ایسے مواقع پر (معاذ اللہ معاذ اللہ) حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا[۹۹]۔ اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپ نے تو یہاں تک دریدہ دہنی

---

[۹۸] اس موقع پر ناظرین اس کتاب کا صفحہ ۱۰۲ نکال کر پورا واقعہ خود دیکھ لیں کہ اصل بات کیا تھی اور اسے توڑ مروڑ کر کیا بنایا جا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ مکۂ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ یہ خواب آپ جوں کا توں اپنے صحابہؓ کو سنا دیتے ہیں اور ان کو ساتھ لیکر عمرہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر نہ تو حضورؐ یہ تصریح کرتے ہیں کہ عمرہ اسی سال ہوگا اور نہ یہی فرماتے ہیں کہ اس سال نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس پر "غلط تاثر دینے" کا الزام کیسے عائد ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک سپہ سالار کو حکومتِ بالادست ایک مہم پر فوج لے جانے کا حکم دیتی ہے۔ سپہ سالار کو معلوم ہے کہ یہ مہم اس سفر میں نہیں بلکہ اس کے بعد ایک اور سفر میں پوری ہوگی، اور یہ مہم اصل مقصد کے لیے راستہ صاف کرنے کی خاطر بھیجی جا رہی ہے۔ لیکن سپہ سالار فوج پر اس کو ظاہر نہیں کرتا اور اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ مجھے یہ مہم انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا اس کو یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس نے فوج کو دھوکا دیا؟ کیا ایک سپہ سالار کے لیے واقعی یہ ضروری ہے کہ حکومتِ عالیہ کے پیشِ نظر جو اسکیم ہے وہ پوری کی پوری فوج پر پہلے ہی کھول دے اور اس بات کی کوئی پروا نہ کرے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے فوج کے عزم پر کیا اثر پڑیگا؟ اگر سپہ سالار فوج سے نہ یہ کہے کہ یہ مہم اسی سفر میں پوری کی جائیگی اور نہ یہی کہے کہ اس سفر میں پوری نہیں کی جائیگی تو اسے آخر کس قانون کی رو سے جھوٹ قرار دیا جائے گا؟

[۹۹] یہ "دروغ گویم بروئے تو" کا مصداق ہے۔ منکرینِ حدیث جھوٹے پروپیگنڈے میں اپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کام لیا ہے کہ یہ کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتے کہ جب تک حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت حضورؐ مساواتِ انسانی کا سبق دیتے رہے۔ اور جب حکومت حاصل ہو گئی تو اس وعظ و تلقین کو (خاکم بدہن) بالائے طاق رکھ کر حضورؐ نے حکومت کو اپنے خاندان میں محدود کر لیا۔[۱۹]

اس درجہ بے باک ہو چکے ہیں کہ ایک شخص کو مخاطب کر کے اس پر رُو در رُو جھوٹا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کیا کوئی صاحب میری کوئی عبارت اس بات کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں کہ "ایسے مواقع پر خود حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا۔" دراصل مَیں نے اپنے ایک مضمون میں جو بات کہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ "ایسے مواقع پر" جھوٹ جائز یا واجب ہے، بلکہ یہ ہے کہ جہاں سچائی کسی بڑے ظلم میں مددگار ہوتی ہو اور اس ظلم کو دفع کرنے کے لیے خلافِ واقعہ بات کہنے کے سوا چارہ نہ ہو وہاں سچ بولنا گناہ ہو جاتا ہے اور ناگزیر ضرورت کی حد تک خلافِ واقعہ بات کہنا بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ایک مثال بھی اسی مضمون میں دی تھی۔ فرض کیجیے کہ اسلامی فوج کی کفار سے جنگ ہو رہی ہے اور آپ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اگر دشمن آپ سے معلوم کرنا چاہے کہ آپ کی فوج کہاں کہاں کس کس تعداد میں ہے اور آپ کے میگزین کس کس جگہ واقع ہیں، اور ایسے ہی دوسرے فوجی راز وہ دریافت کرے تو فرمائیے کہ اس وقت آپ سچ بول کر دشمن کو تمام اطلاعات صحیح صحیح بہم پہنچا دیں گے؟ ڈاکٹر صاحب اگر اس پر معترض ہیں تو وہ اب اس سوال کا سامنا کریں اور اس کا صاف صاف جواب عنایت فرما دیں۔

۱۹ یہ رُو در رُو بہتان کی ایک اور مثال ہے۔ میرے جس مضمون کا حلیہ بگاڑ کر میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اسلام کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں اندھا دھند طریقوں سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ کسی اصول کو کسی معاملہ پر منطبق کرتے ہوئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس کو نافذ کرنے کے لیے حالات سازگار ہیں یا نہیں۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو پہلے انہیں سازگار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے پھر اسے نافذ کرنا چاہیے۔ اس کی مثال میں یہ بتایا گیا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو شخص اس ذات گرامی کے خلاف یہ کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے اس نے اگر یہ کہہ دیا کہ حضورؐ نے پوری بات اپنے قریب ترین صحابہ سے بھی چھپا رکھی تھی تو اسے اس سے کیا شرم آ گئی پھر یہ بھی سوچیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ یہ معاملہ آخر تک یوں ہو گا تو پھر صحابہ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا پڑی تھی کہ "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا، تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور داخل ہو گے"؟ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو تردد ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں خدا نے مجھے سچا خواب دکھایا تھا یا یونہی کہہ دیا تھا کہ مکے چلے جاؤ، تم مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور اس تردد کو دور کرنے کے لیے خدا کو بارِ دیگر یہ یقین دلانا پڑا کہ آپ متردد نہ ہو جایئے۔ ہم نے سچا خواب دکھایا تھا۔ آپ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے[۹۲]۔

مولانا! ذرا سوچیے کہ آپ محض اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں سچا بننے کے لیے کیا کیا حرکات کر رہے ہیں۔ بات کس قدر صاف تھی۔ حضورؐ نے ایک خواب دیکھا اور اس کے

کہ اگرچہ اسلام کے اصولِ مساوات کا یہ تقاضا تھا کہ دوسرے تمام مناصب کی طرح خلیفہ کے انتخاب میں بھی صرف اہلیت کو پیشِ نظر رکھا جاتا اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا کہ اہل آدمی کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ عرب کے حالات خلافت کے معاملہ میں اس قاعدے کو نافذ کرنے کے لیے اس وقت سازگار نہیں ہیں، اور ایک غیر قریشی کو خلیفہ بنا دینے سے آغاز ہی میں اسلامی خلافت کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہے، تو آپ نے ہدایت فرما دی کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اس بات کو جو معنی ڈاکٹر صاحب نے پہنائے ہیں، انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

۹۲؎ اعتراض کے شوق میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ "تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے" کا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ صیغہ جمع ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صحابہ حضورؐ کے ساتھ آئے تھے اُن کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا تم لوگ ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اللہ نے اس خواب کو سچا کر دکھایا اور حضور مکے میں داخل ہوگئے۔ اس میں کونسی پیچیدگی تھی جس کے حل کرنے کے لیے آپ کو اس قدر افسوس ناک افسانے تراشنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔

۲۵۔ نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْر کا مطلب تیسری آیت آپ نے یوں پیش کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضور اس پر باز پرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضور جواب دیتے ہیں کہ نبانی العلیم الخبیر (مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔"

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں:

"فرمایئے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا۔"

جی ہاں! آپ کے حاشیہ نشینوں کے نزدیک تو بالکل ثابت ہوگیا لیکن ذرا قرآنی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے ہیں:

پہلے تو یہ فرمایئے کہ حضور نے جب کہا کہ مجھے "علیم و خبیر" نے خبر دی ہے تو اس سے کیسے ثابت ہوگیا کہ حضور نے فرمایا تھا کہ مجھے خدا نے خبر دی ہے۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ حضور کو اس نے خبر دی جسے اس راز کی علم و آگہی ہوگئی تھی۔[۹۳]

---

[۹۳] اس کتاب کا صفحہ ۲۰۰ نکال کر دیکھیے۔ سورۂ تحریم کی جس آیت پر ڈاکٹر صاحب یہ تقریر فرما رہے ہیں وہ پوری نقل کر دی گئی ہے۔ اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ "اَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ" "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا"۔ اس لیے نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ "مجھے علیم و خبیر نے بتایا" سے مراد لامحالہ اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تمہیں یہ علم نہ ہو کہ میں نے وہ کہی ہے۔ کیونکہ جو میری طرف جھوٹی بات منسوب کریگا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا لا تکذبوا علیّ فانہ من کذب علیّ فلیلج النار۔" میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو، کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا" (بخاری)

حضرت سلمہؓ کہتے ہیں سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علیّ ما لم اقل فلیتبوأ مقعدہ من النار۔" میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے" (بخاری)

کیا یہ بار بار کی سخت وعید یہی ظاہر کرتی ہے کہ حضورؐ کے ارشادات کی دین میں کوئی اہمیت نہ تھی؟ اگر آپ کی سُنت کی کوئی قانونی حیثیت دین میں نہ ہوتی اور اس سے احکامِ دین کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جہنم کی وعید سنا سنا کر لوگوں کو جھوٹی حدیث روایت کرنے سے روکا جاتا؟ بادشاہوں اور رئیسوں کی طرف تاریخوں میں بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ ان سے آخر دین پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر حضورؐ کی سنت کی بھی یہی حیثیت ہے تو آپ کی تاریخ کو مسخ کر دینے کی یہ سزا کیوں ہو کہ آدمی کو داخلِ جہنم کر دیا جائے؟

سنتِ رسولؐ کے حجت ہونے کی صحیح دلیل اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ایک مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی صاف صاف تصریحات موجود ہوں تو اس کے بارے میں غیر متعلق چیزوں سے نتائج نکالنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنے رسول کو تشریحِ کتاب اللہ کے اختیارات بھی دیئے ہیں اور تشریعی اختیارات بھی۔ سورۂ نحل کی آیت ۴۴، سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷، اور سورۂ حشر کی آیت ۷، جنہیں اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں، اس معاملے میں بالکل واضح ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف اپنے ان اختیارات کو بیان کیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل کیا تھا جس طرح ایسے حالات میں علم حاصل کیا جاتا ہے۔[94]

۳۶ - چوتھی آیت آپ نے **حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا نکاح خدا کے حکم سے ہوا تھا یا نہیں؟** اس طرح پیش کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضور ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر مخالفین اور منافقین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا تھا۔ فلما قضی زید منها وطرا زوجنكها لكي لا يكون على المؤمنين حرج في ازواج ادعيائهم اذا قضوا منهن وطرا (۳۳/۳۷)

"پھر جب زید کا جی اس سے بھر گیا تو ہم نے اس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں (یعنی طلاق دے چکے ہوں)۔"

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں کہ اللہ نے نبی اکرم کو جو حکم دیا تھا کہ تم زید کی بیوی سے

---

[94] اس تقریر کی داد ڈاکٹر صاحب کو ہر وہ شخص خود دے لیگا جس نے سورۂ تحریم کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہو۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانی ذرائع سے اس بات کی اطلاع ہوئی ہوتی تو محض اتنا سا واقعہ کہ بیوی نے آپ کا راز کسی اور سے کہہ دیا اور کسی مخبر نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی سرے سے قرآن میں قابلِ ذکر ہی نہ ہوتا، نہ اس بات کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا"، اور "مجھے العلیم الخبیر نے بتایا"۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو اس شان سے بیان کرنے کا تو مقصد ہی لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں بلکہ اس رسول سے ہے جس کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکاح کر لو تو وہ قرآن میں کہاں ہے؟ پہلے تو یہ دیکھیے کہ آپ نے دو مرتبہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے وہ نکاح "خدا کے حکم" سے کیا تھا۔ حالانکہ آیت میں لفظ یہ ہے کہ زوّجنٰکھا، جس کا ترجمہ آپ نے بھی یہ کیا ہے کہ "ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا"

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جو باتیں خدا کے بتائے قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائیں انہیں خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سرزد ہوں۔ جیسے (مثلاً) سورہ انفال میں مقتولین جنگ کے متعلق ہے فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم (۸/۱۷) "انہیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا" حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ قتل جماعت مومنین کے ہاتھوں ہی سرزد ہوا تھا۔ یا جس طرح (مثلاً) سورۂ بقرہ میں کہا کہ ختم اللہ علی قلوبھم . . . (۲/۷) "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی" اور دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون (۸۳/۱۴) "ہرگز نہیں بلکہ وہی ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا جو وہ کماتے تھے" یعنی خود ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیں۔ یہی مطلب زوّجنٰکھا سے ہے یعنی حضورؐ نے وہ نکاح خدا کے قانون کے مطابق کیا۔ وہ قانون یہ تھا کہ تم پر حرام ہیں حلائل ابناءکم الذین من اصلابکم (۴/۲۳) "تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں" اور چونکہ منہ بولا بیٹا صلبی بیٹا نہیں ہوتا اس لیے اس کی بیوی سے نکاح حرام نہیں۔ جائز ہے۔ حضورؐ نے خدا کے اس حکم کے مطابق حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تھا۔[95]

---

[95] ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تو قرآن سے صرف اپنا مطلب نکالنا ہے۔ لیکن اس بحث کو جو لوگ سمجھنا چاہتے ہوں ان سے میں عرض کروں گا کہ براہ کرم سورۂ احزاب کی پہلی چار آیتیں بغور پڑھیے اور پھر وہ آیتیں دیکھیے جن میں حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر ہے پہلی چار آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ اے نبی کافروں اور منافقوں سے نہ دبو اور اللہ کے بھروسے پر اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے۔ منہ بولے بیٹے ہرگز اصلی بیٹے نہیں ہیں، یہ صرف ایک قول ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۷۔ پانچویں آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ حضورؐ نے جب بنی نضیر کے خلاف فوج کشی کی تو اس وقت گرد و پیش کے بہت سے | "باذن اللہ" سے مراد قاعدہ جاریہ ہے یا حکم الٰہی ؟

جو تم لوگ منہ سے نکال دیتے ہو۔ اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ اشارہ تو صاف ملتا ہے کہ جس وحی کا ذکر آیت نمبر ۴ میں کیا گیا ہے وہ منہ بولے بیٹوں کے معاملہ سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی صراحت اس امر کی نہیں ہے کہ اس رسم کو توڑنے کے لیے حضورؐ کو خود اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آیات نمبر ۳۷۔۳۹ کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۔ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَۨا الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۔

پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہل ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دیا ہو۔ اللہ کا یہی طریقہ ان لوگوں کے لیے بھی مقرر تھا جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ کا حکم (ان پیغمبروں کے لیے) ایک جچا تلا فیصلہ ہے جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

اس پوری عبارت پر اور خصوصاً خط کشیدہ فقروں پر غور کیجیے۔ کیا یہ مضمون اور یہ انداز بیان یہی بتا رہا ہے کہ ایک کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے قانون کے مطابق کیا تھا اس لیے اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا؟ یا یہ صاف طور پر اس بات کی صراحت کر رہا ہے کہ اس نکاح کے لیے اللہ تعالیٰ

© rasailojaraid.com